سوزِ وطن
پریم چند
مقدمہ و حواشی
علی احمد فاطمی
انجمن تہذیبِ نو پبلیکیشنز ڈویژن
۲۷۲ چک، الہ آباد ۳

طبع اول - - - - - - - فروری ۱۹۸۰ء

تعداد - - - - - - - - - ایک ہزار

کتابت - - - - - - - - فیاض احمد

طباعت - - - - - - - - تاج آفسٹ پریس ۲۹۶ بخشی بازار الہ آباد

قیمت - - - - - - - - چھے روپے

ناشر : ذوالفقار صدیقی

تہذیبِ نو پبلیکیشنز ۲۷۲ - چک - الہ آباد

- پہلا اڈیشن ۱۹۰۸ء زمانہ پریس کانپور
- دوسرا اڈیشن ۱۹۲۹ء گیلانی الیکٹرک پریس لاہور
- تیسرا اڈیشن ۱۹۸۰ء تہذیبِ نو پبلیکیشنز الہ آباد

فہرست

سوزِ وطن —— چند خیالات

یوں تو پریم چند کی ادبی زندگی اور بیسویں صدی ایک ساتھ شروع ہوتی ہے۔ بعض مضامین سوانح عمریاں اور پھر بعد میں ناول (اسرارِ معابد، ہم خرما و ہم ثواب اور کرشنا) اس کے ثبوت ہیں لیکن کہانی کے سلسلے میں عام طور پر خیال یہ ہے کہ پریم چند کی پہلی کہانی دنیا کا سب سے انمول رتن ہے۔ خود پریم چند نے اپنی پہلی کہانی اسی کو قرار دیا اور اس کی اشاعت ۱۹۰۷ء بتائی۔ لیکن ایک جگہ یہ تحریر ملتی ہے :

" میری پہلی کہانی کا نام تھا 'دنیا کا سب سے انمول رتن'۔ یہ ۱۹۰۷ء میں زمانہ میں چھپی۔ اس کے بعد میں نے چار پانچ کہانیاں اور لکھیں......"

(قلم کا مزدور ص ۲۲)

ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں :

" پریم چند کی ابتدائی کہانیوں اور سوزِ وطن سے متعلق .... یہ خیال اور قیاس غلط اور بے بنیاد ہے کہ چونکہ بقول پریم چند اس مجموعہ کی ایک کہانی اور پریم چند کی پہلی کہانی دنیا کا سب سے انمول رتن ۱۹۰۷ء میں رسالہ زمانہ میں شائع ہوئی اس لیے باقی کہانیاں بھی اس میں شائع ہوئی ہوں گی۔ یہ غلط فہمی خود پریم چند کے اس بیان سے ہوتی ہے ...... اس سلسلے میں پہلی بات یہ کہ دنیا کا سب سے انمول رتن نام کی کہانی زمانہ میں کبھی شائع نہیں ہوئی۔ دوسری بات یہ کہ اگست ۱۹۰۷ء سے لے کر دسمبر ۱۹۰۹ء تک زمانہ میں پریم چند کی چار پانچ کہانیاں نہیں بلکہ اس مجموعے میں شامل ہونے والی صرف ایک کہانی عشقِ دنیا اور حبِ وطن ہی شائع ہوئی۔ باقی چار کہانیاں اوّلاً کہاں شائع ہوئیں؟ اس کا اب تک کوئی سراغ نہ مل سکا۔ میرا اپنا خیال یہی ہے کہ یہ کہانیاں کتابی صورت میں

ہی شائع ہوئیں۔ امرت رائے اور مدن گوپال بھی میرے اس خیال سے متفق ہیں۔"

(تلاش و توازن ص ۱۰۵۔۱۰۴)

یہ حقیقت ہے کہ اس سلسلے میں خود پریم چند کے بیانات متضاد ہیں لیکن یہ بات تو طے ہے کہ دنیا کا سب سے انمول رتن اور سوزِ وطن کی بقیہ چار و کہانیاں جون ۱۹۰۸ء سے قبل لکھی گئیں۔ اور جس میں عشقِ دُنیا اور حبِّ وطن (اپریل ۱۹۰۸ء) کے علاوہ کسی کہانی کے بارے میں پتہ نہیں چلتا ہے کہ وہ کب اور کس رسالے میں شائع ہوئیں۔ اسی لیے قمر رئیس صاحب یہ قیاس کر گئے جس سے سب اتفاق بھی کرتے ہیں۔

ایک اور طویل کہانی روٹھی کہانی اپریل سے اگست ۱۹۰۷ء کے زمانہ میں شائع ہوئی۔ امرت رائے لکھتے ہیں:

"متفرق مضامین تو اس طرح لکھے ہی دو طویل قصے بھی اس درمیان شائع ہوئے۔ ایک تو راجپوتانے کی کہانی تھی روٹھی رانی جو اپریل سے اگست ۱۹۰۷ء تک کے زمانہ میں قسط وار شائع ہوئی۔ دوسری کشنا جو تقریباً انھیں دنوں کتاب کی صورت میں بنارس کے میڈیکل ہال پریس سے شائع ہوئی۔"

(قلم کا سپاہی ص ۹۹)

سوزِ وطن جون ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس پر سبھی اتفاق کرتے ہیں۔ اس میں پانچ کہانیاں تھیں۔ دنیا کا سب سے انمول رتن۔ شیخ مخمور۔ یہی میرا وطن ہے۔ صلۂ ماتم۔ عشقِ دنیا اور حبِّ وطن اس مجموعے میں روٹھی رانی کیوں نہیں شامل ہوئی۔ شاید اس کی دو تین وجہیں ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کا خیال ہے:

"اب تک دستیاب ہونے والی پریم چند کی پہلی مطبوعہ کہانی روٹھی رانی ہے۔ جو زمانہ میں اپریل۔ مئی۔ اگست ۱۹۰۷ء کی تین اشاعتوں میں بالاقساط شائع ہوئی لیکن جو سوزِ وطن میں شامل نہیں کی گئی اس لئے کہ وہ "طبع زاد" نہیں تھی۔"

(تلاش و توازن ۱۰۶)

تو پھر اس کا ماخذ کیا ہے؟ اس سلسلے میں راقم الحروف نے ڈاکٹر قمر رئیس صاحب سے رابطہ قائم کیا جس کے جواب میں انھوں نے لکھا:

"روٹھی رانی" کہاں سے لی گئی۔ ماخذ کیا ہے؟ یہ بات تحقیق طلب ہے۔ شاید ٹاڈ (TOD) کی راجستھانی کہانیوں سے لی گئی ہو لیکن ماخوذ ہے طبع زاد نہیں۔ اس قصہ کے سات ابواب زمانہ کے اپریل و مئی ۱۹۰۷ء کے مشترکہ شمارہ میں شائع ہوئے۔ باقی چار ابواب اگست ۱۹۰۷ء کے شمارہ میں چھپے۔ اس شمارہ کے صفحہ ۱۵۱ پر جہاں قصہ ختم ہوتا ہے لکھا ہے (ماخوذ تر جمۂ ہندی) اس سے بات صاف ہو جاتی ہے...... روٹھی رانی کو طویل کہانی اور ناولٹ دونوں کہا جاسکتا ہے لیکن میرے خیال میں وہ اپنی فنی ساخت اور قصہ کی تہہ داری کی بنا پر ناولٹ سے زیادہ قریب ہے......"

بعد میں اسے طویل کہانی کے بجائے ناولٹ ہی سمجھا گیا۔ امرت رائے جو قلم کا سپاہی، میں کہانی کہتے ہیں بعد میں ہندی کے منگلا چرن کے عنوان سے ناولٹ کی شکل میں ترجمہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس مجموعے کی ساری کہانیاں حب الوطنی پر منحصر ہیں اور روٹھی رانی بقول نوبت رائے نظر کہ اس میں عورتوں کے ایک خاص مزاج کا مذاق اڑایا گیا ہے کہ جسے انگریزی میں کیری کیچر کہتے ہیں۔

یہ خیال رہے کہ اب تک کی تمام کہانیاں نواب رائے کے نام سے ملتی ہیں کیونکہ پریم چند کا گھر کا نام نواب رائے تھا جو ان کے چچا نے رکھا تھا (ان کے والد کا رکھا ہوا نام دھنپت رائے تھا)

یہ نواب رائے پریم چند کیسے بنے؟ اس کی ایک کہانی ہے۔

جون ۱۹۰۸ء میں سوز وطن کی اشاعت ہوئی۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں زمانہ میں اس کے اس کے اشتہار ملنے لگتے ہیں۔ یہ اشتہار فروری ۱۹۰۹ء تک شائع ہوتے رہے منشی دیا نرائن نگم کے خطوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اشتہار خود پریم چند ہی لکھا کرتے تھے۔ اشتہار کی زبان یوں تھی۔

" اردو زبان میں حسن و عشق۔ وصل فراق، عیاری و مکاری۔ جنگ و جدل وغیرہ

کی بہت سی داستانیں موجود ہیں۔ ان میں بعض بہت دلچسپ ہیں مگر ایسے
قصے جن میں سوزِ وطن کی چاشنی ہو، جن میں حبِ وطن ایک ایک حرف سے
ٹپکے اس وقت تک معدوم ہیں۔ اس کتاب میں پانچ قصے لکھے گئے ہیں
اور سب دردِ وطن کے جذبات سے پُر ہیں ممکن نہیں کہ انھیں پڑھ کر ناظرین
کے دل میں وطن کا پاک جذبہ موجزن نہ ہو جائے۔"

(सारिका OCT-79)

پریم چند کو اپنی اس کتاب کی ندرت اور اہمیت کا احساس تھا۔ اس وجہ سے
انھوں نے اسے ہندی والوں تک پہنچانے کی کوشش کی اور پنڈت مہاویر پرساد دویدی جو
ان دنوں سرسوتی کے ایڈیٹر تھے۔ سوزِ وطن کی ایک کاپی بھیجی اور خط لکھا۔

جناب ایڈیٹر صاحب تسلیم۔
اپنی ایک ناچیز کتاب ریویو کے لئے روانہ خدمت کر رہا ہوں۔ مناسب ریویو
فرما کر مشکوری کا موقع دیجئے۔ امید ہے کہ ریویو کسی تارہ نمبر میں نکلے گا۔
یہ کتاب نفاعِ عام کے لئے لکھی گئی ہے اس لحاظ سے قیمت بھی ارزاں رکھی
گئی ہے۔ ذاتی نفع مقصود نہیں۔ بر وقت ریویو کتاب ملنے کا پتہ جو ذیل میں
درج ہے ضرور نوٹ فرما دیجئے گا۔ نوازش ہو گی۔

نیازمند

نواب رائے

پنڈت جی نے اس مجموعے کو پوری عزت دی اور خود تبصرہ کر کے سرسوتی کے دسمبر
۱۹۰۸ء کے شمارہ میں شائع کیا۔ اس اعتبار سے کسی بھی اردو کتاب پر ہندی رسالہ میں یہ پہلا
تبصرہ تھا جو خود ایڈیٹر نے کیا تھا۔

ابھی یہ سب ہو ہی رہا تھا کہ ایک بڑی مصیبت نازل ہوئی۔
پریم چند کا تبادلہ مہوبہ ہو گیا اور ابھی چار پانچ ہوئے تھے کہ ایک رات شہر کے حاکمِ اعلیٰ

کا بُردوا : پہنچا کر جلد ملو۔ راتوں رات بیل گاڑی سے چالیس میل کا سفر طے کر کے کل پہاڑ پہنچے۔ دوسرے دن صاحب سے ملے۔ سامنے سوزِ وطن کی ایک کاپی رکھی ہوئی تھی۔ پوچھا۔ یہ کتاب تم نے لکھی ہے؟" انھوں نے اقرار کرلیا۔ ایک ایک کہانی کا مقصد پوچھا۔ پھر آخر میں بگڑ کر بولے "تمھاری کہانیوں میں بغاوت کی بو آرہی ہے۔ تمھاری قسمت اچھی ہے کہ تم انگریزی حکومت میں ہو ورنہ مغلوں کی حکومت میں ہوتے تو ہاتھ پاؤں کٹوا لئے جاتے۔ تم نے اپنی کہانیوں میں انگریزی حکومت کی توہین کی ہے۔ اس کتاب کی ساری کاپیاں سرکار کے حوالے کردو"۔

پریم چند نے حامی بھرلی اور سمجھے کہ چھوٹ گئے۔ گھر پہنچے تو بیوی (شیورانی دیوی) نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

آپ بولے۔ سوزِ وطن کے سلسلے میں سرکار نے مجھے بُلایا تھا"۔

میں نے پوچھا۔ آخر بات کیا تھی۔؟

آپ بولے۔ کلکٹر نے اسی سلسلے میں مجھے بلایا تھا۔ میں گیا تو کلکٹر کی میز پر سوزِ وطن کی کاپیاں پڑی تھی۔

میں نے پوچھا۔ کیا ہوا تب؟

پریم چند نے بیوی کو تفصیل بتائی اور انھوں نے پھر سوال کیا۔

آپ کتابیں بھیج دیجئے گا۔؟"

آپ بولے" واہ! ارے یہ کہو کہ سستے چھوٹ گئے۔ میرا خیال تھا کہ کوئی بڑی آفت آ گئی"۔

میں نے کہا "تو پھر لکھنا بھی اب بند ہی سمجھوں"۔

آپ بولے "لکھوں گا کیوں نہیں! نقلی نام رکھنا پڑے گا۔ خیر اس وقت تو بلا ٹلی مگر سوچتا ہوں ابھی یہ اور رنگ لائے گا"۔

(پریم چند گھر میں صفحہ ۲)

سوزِ وطن کی ایک ہزار کاپیاں چھپی تھیں سو فروخت ہو چکی تھیں باقی سات سو سرکار کے حوالے کردیں حالانکہ ایک جگہ پریم چند نے چھ سو جمع کرنے کے بارے میں لکھا ہے۔ امرت رائے لکھتے ہیں:

"لہٰذا پہلا کام تو نواب رائے نے یہ کیا کہ سوزِ وطن کی کچھ ہی کاپیاں کلکٹر صاحب کے حوالے کیں جو آگ کی نذر کردی گئیں مگر جو کاپیاں زمانہ کے دفتر میں بچ گئیں ان پر کسی کا دھیان نہ گیا اور وہ خفیہ طور پر بکتی رہیں۔"

(قلم کا سپاہی ۱۰۶)

منشی دیا نرائن نگم نے ان بچی ہوئی کاپیوں کو خفیہ طور پر فروخت کے سلسلے میں لکھا ہے حکومت نے نواب رائے کی تحریر پر پابندی لگادی۔ ۱۲ مئی ۱۹۱۰ء کو وہ دیا نرائن نگم کو خط لکھتے ہیں۔

"تو نواب رائے غالباً کچھ دنوں کے لئے جہان سے گئے۔ . . . . . میں کوئی مضمون خواہ کسی موضوع پر خواہ ہاتھی دانت پر ہی کیوں نہ لکھوں مجھے پہلے جناب فیضیاب کلکٹر بہادر کی خدمت میں پیش کرنا پڑے گا۔ اسی لئے کچھ دنوں کے لیے نواب رائے مرحوم ہوئے ان کے جانشین کوئی اور صاحب ہوں گے۔"

(پریم چند کے خطوط از مدن گوپال ص ۶۳)

اب دوسرے نام کی تلاش ہوئی۔ منشی نگم نے پریم چند نام پیش کیا جس کے جواب میں انھوں نے لکھا۔

"پریم چند نام اچھا ہے مجھے بھی پسند ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ پانچ چھ سال میں نواب رائے کو فروغ دینے کی جو محنت کی گئی تھی وہ سب بیکار گئی۔"

اور تب یوں پریم چند کا جنم ہوا۔ اس نئے نام نے اور بھی جوش و جذبہ عطا کیا۔ اس نئے نام سے پہلی شائع شدہ کہانی بڑے گھر کی بیٹی جو دسمبر ۱۹۱۰ء میں زمانہ میں چھپی۔ اس واقعہ اور نئے نام کی تبدیلی کے درمیان یعنی مارچ ۱۹۱۰ء سے اگست ۱۹۱۰ء تک پریم چند کی تین کہانیاں گناہ کا اگن کنڈ۔ سیر درویش اور رانی سارندھا بغیر کسی نام کے شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

"دنیائے ادب میں پریم چند کا جنم دسمبر ۱۹۱۰ء میں ہوا۔ جب اس نام سے ان کی پہلی کہانی 'بڑے گھر کی بیٹی' شائع ہوئی لیکن یہ سوچنا غلط ہوگا کہ پریم چند نام اختیار کرنے کے بعد انھوں نے اپنے پچھلے ناموں کو یکسر ترک کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۴ء تک وہ رسالہ ادیب۔ العصر۔ ہمدرد۔ اور آزاد وغیرہ میں نواب رائے اور د۔ ر (دھنپت رائے) کے ناموں سے بھی لکھتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ اس دور میں انھوں نے برطانوی سرکار کو دھوکہ دینے اور معاوضے کی خاطر کچھ دوسرے فرضی ناموں سے بھی لکھا!"

(تلاش و توازن ۱۰۹-۱۰۸)

قمر رئیس صاحب کا خیال ہے کہ انھوں نے بمبوق اور یتیم کے ناموں سے بھی کہانیاں لکھی ہیں۔ اگر مزید تلاش و جستجو کی جائے تو دوسرے فرضی ناموں سے بھی کہانیاں مل سکتی ہیں۔

۱۹۲۰ء میں پریم چند نے ان پابندیوں سے تنگ آکر ملازمت چھوڑ دی۔

۱۹۲۹ء میں گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے سوزِ وطن کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا جس میں ان پانچ کہانیوں کے علاوہ "سیرِ درویش" بھی شامل ہے۔ یہ کہانی زمانہ کی اپریل۔ مئی۔ جون کے شمارے میں قسط وار شائع ہوئی تھی۔

محولہ بالا تمام امور پر امرت رائے۔ قمر رئیس۔ مدن گوپال۔ ہنس راج۔ رہبر اور ہندی کے بعض معتبر ناقدین اتفاق کرتے ہیں۔

ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

"وقار عظیم۔ سید احتشام حسین اور بعض دیگر ناقدین نے لکھا ہے کہ اردو میں مختصر افسانہ کے فن کو متعارف کرانے کی اولیت پریم چند کو حاصل ہے اور اس کے ثبوت میں سوزِ وطن کی کہانیوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء تک پریم چند نے جو کہانیاں لکھیں ان میں مختصر افسانہ کے فن کا

کوئی اندازہ یا تصور نہیں ملتا۔ یہ مختصر بیانیہ قصے ہیں جن میں قدیم داستانوں
کے اثرات اور ایسے بزمیہ اور رومانی عناصر غالب ہیں جنھیں پریم چند نے
ویر رس اور پریم رس کا نام دیا تھا۔ داستانوں کی طرح ان کی بھی زبان آراستہ
اور پر تکلف ہے۔

(تلاش و توازن ص ۱۰۰)

سوزِ وطن کی کہانیاں فن کے اعتبار سے کس پایہ کی ہیں اور یہ جدید مغربی تصور
و معیار کی آئینہ دار ہیں یا نہیں۔ یہ الگ بحث ہے جس پر جتنی بات کی جائے گی پھیلتی
جائے گی۔ لیکن یہ بات ضرور سوچی جا سکتی ہے کہ اسی مغربی تصور یا فضا کی وجہ سے
آج تک کہانی میں جو اتھل پتھل ہے اس کے تناظر میں اور کہانی کے اس ہنگامی دور میں
جہاں شہر افسوس، استعارے۔ دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم۔ کمتی۔ پرندہ پکڑنے والی
گاڑی۔ الف۔ لام میم۔ بے محاورہ۔ بیچ کا ورق جیسے رنگا رنگ اور گرما گرم مجموعے شائع
ہو رہے ہوں وہاں سوزِ وطن جیسے فرسودہ اور روایتی مجموعے کی اشاعت! چہ معنی دارد؟
افسانے سے متعلق اس چیختے اور گرجتے ہوئے ماحول میں پر سکون افسانوں کی بات
کرنا کہاں تک مناسب ہے۔ اس کا اندازہ وہ لوگ لگا سکتے ہیں جو دونوں قسم کے افسانوی
مزاج سے واقفیت رکھتے ہیں۔

ان متضاد کیفیات میں سوزِ وطن کے افسانوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں تھوڑی دیر
کے لیے پر سکون ہونا پڑے گا اور اس دور کے تمام ہنگاموں سے دور تقریباً ستر سال پیچھے
لوٹنا پڑے گا جہاں ہنگامے تو ہیں لیکن ان کی نوعیت دوسری ہے۔

جس وقت پریم چند کا ذہن شعور کے سانچے میں ڈھل رہا تھا۔
قوم بھی سیاسی تقلیب میں مبتلا تھی۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب نرم پڑ چکا تھا۔ ایک طویل خاموشی طاری ہو رہی تھی۔ یہ خاموشی
دائمی نہ تھی بلکہ اندر ہی اندر ایک تڑپ۔ ایک چبھن عوام کے ذہنوں کو کرید رہی تھی۔ یہ ناکامی

دراصل ایک پیش خیمہ تھی۔ یہ خاموشی اس وقت جب آنند موہن بسو۔ سریندر ناتھ بنرجی اور یوگندر نے مل کر ۱۸۷۲ء میں انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی۔

۱۸۵۸ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام نے اس خاموشی کو ریزہ ریزہ کردیا۔

۱۸۹۳ء میں امریکہ میں دئے ہوئے سوامی وویکانند کے لکچر نے ہندوستانیوں کے دلوں میں خون کا دوران تیز کردیا۔

گوکھلے۔ دادا بھائی نوروجی۔ مدن موہن مالویہ۔ فیروز شاہ مہتا۔ راناڈے اور سب سے بڑھ کر بال گنگادھر تلک نے مل کر آزادی کو اپنا پیدائشی حق اعلان کردیا۔

ان سب کی سیاسی سرگرمیاں تاریخ بدل رہی تھیں اور ہندوستان ایک نئی فضا میں سانس لینے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔

۱۹۰۵ء میں بنگال کے دو ٹکڑے کرنے کے بعد حکومت وقت نے چاہا کہ ہر شے کے ٹکڑے ہو جائیں اور عدم اتحاد کی تحریک چلادی جائے۔ اس کوشش نے اور بھی اتحاد پیدا کیا اور سب مل کر سر سے کفن باندھ کر صرف ایک مقصد کے لئے آگے بڑھے اور وہ تھا حصول آزادی۔ روز بروز بڑھتی ہوئی قوت۔ ہر دن ہونے والے جلسے جلوس نے انگریزی ذہن کو منتشر کردیا۔

دہشت پسند جانبازوں نے ملک کی آزادی کے لیے اپنے ڈھنگ سے جہاد شروع کردیا تھا۔ خودی رام بوس نے ۳۰ اپریل ۱۹۰۸ء کو مظفر پور میں بم سے دھماکے کئے — پھر اخبار کی آزادی چھین لی گئی۔ کتابوں کی اشاعت بند کردی گئی۔

لیکن جیسے جیسے روک تھام بڑھی۔ قدم اور آگے بڑھتے گئے۔

یہ ساری باتیں ایک لاوے کی طرح پریم چند کے ذہن میں جذب ہوتی رہیں اور اندر گھُٹے ہوئے انسان کو جگاتی رہیں۔

کانپور کے ایک کونے میں بیٹھ کر ماسٹری کرتے ہوئے منشی جی نے بھی اس آواز کو سنا اور سمجھا۔

ایک طرف یہ خوش فشاں ماحول، دوسری طرف پندرہ برس کی عمر میں طلسم ہوشربا کے پچیس ہزار اوراق ہضم کرنے والا نرم و معصوم ذہن اس پر سرشار۔ شرر اور رسوا کے ناولوں کا پُر شوق مطالعہ۔ حکیم برہم گورکھ پوری کے ناول کشتۂ کنور پر تبصرہ ذکاء اللہ کا مُنہ توڑ جواب۔ کانپور میں دیا نرائن نگم۔ نوبت رائے نظر۔ پیارے لال شاکر۔ وغیرہ کے ساتھ گذری ہوئی صحبتوں نے ان کے ذہن کو کس طرح کے سانچے میں ڈھالا ہوگا۔ اس کا اندازہ اچھی طرح سے لگایا جا سکتا ہے۔

ایسے ہی ذہن اور ایسے ہی دماغ نے جب پہلی بار کہانی کی طرف رُخ کیا تو بقول امرت رائے کرودھ کی ایک چیخ کی طرح یہ کہانیاں اس وقت کی فضا میں گونج گئیں۔ فراق نے بھی کہا تھا۔

"جیسے ایک ٹینک کو اکھاڑنے کے لیے ایک چھوٹا لیکن مناسب مقام پر رکھا ہوا بم ہو۔"

ایسے میں ہی ایک سوال اُٹھا کہ دُنیا کی سب سے قیمتی شے کیا ہے؟

ایک پھانسی پانے والے باپ کے دو آنسو؟ نہیں!

اپنے شوہر کے ساتھ بھسم ہو جانے والی ایک ستی عورت کی خاک؟ نہیں۔

خون کا وہ آخری قطرہ جو ملک کی آزادی کے لئے گرے۔ وہی دنیا کا سب سے انمول رتن ہے۔

کچھ یہی جذبہ بعد کی چاروں کہانیوں میں جلوہ گر ہے۔

یہ تو وہ کہانیاں تھیں جو آج سے ستر سال قبل لکھی گئیں۔ زبان اور اسلوب کے اعتبار سے جو بھی رہی ہوں لیکن سوچ اور فکر کے اعتبار سے اُس دور کی سیاسی۔ سماجی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ کیا کوئی اس سے اختلاف کر سکتا ہے؟

اب یہ کہانیاں مغربی تصور سے ہم آہنگ ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کی تاریخی حیثیت و اہمیت سے کون انکار کر سکے گا۔ ان میں گرمی ہے حدّت ہے۔ حرارت ہے۔ اپنے وقت کی آواز

ہے اور اچھا لٹریچر وہی ہے جو اپنے آپ میں اپنے سماج کے تمام مسائل سمیٹ لے اور اس کی جیتی جاگتی تصویر پیش کر دے۔

اردو میں بھی ماہرین پریم چند کی کمی نہیں جس کو دیکھو پریم چند کا ماہر بنا ہوا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اردو میں پریم چند پر نہیں کے برابر کام ہوا ہے۔ اور ہندی ادب میں پریم چند پر بہت سے قابل اعتبار کام ہوئے ہیں۔ پریم چند کی زندگی اور فن سے متعلق شاید ہی کوئی پہلو ہو جس پر ہندی تحقیق و تنقید کی نظر نہ پہنچی ہو ۔ لیکن افسوس کہ پھیلے ہوئے سمندر میں اس گوہر آبدار (سوزِ وطن) پر بہت کم توجہ دی گئی۔ شاید اس کی وجہ پریم چند کو خانے میں تقسیم کرنا ہے تبھی تو ہندی کے ایک ادیب نے بے نڈر ہو کر یہ بات کہہ دی :

"یہ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ہندی کہانی کے نقادوں نے پریم چند کی تخلیقات کے تجزیہ کے سلسلے میں دُہری پالیسی اختیار کی ہے۔ ہندی کہانی کی ابتدا کے ذکر کے وقت ان نقادوں نے سوزِ وطن کا ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ ہندی کہانی کی تاریخ لکھتے وقت کسی اردو افسانوی مجموعہ کا ذکر کیسے کر سکتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق ہندی کہانی کے ارتقا کے سلسلے میں پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اسی لیے بنگ خاتون کی 'دلائی والی'، جے شنکر پرشاد کی 'گرام'، چندردھر شرما گلیری کی 'سکھمے جیون' وغیرہ کے ساتھ سوزِ وطن کی کہانیوں کا ذکر غیر ضروری سمجھا۔ ان نقادوں کی یہ دُہری پالیسی اس وقت اور ظاہر ہو جاتی ہے جب یہ نقاد اردو کہانی کفن کو ہندی کی اوریجنل کہانی مانتے ہوئے اسے ہندی کہانی کو نیا موڑ دینے والی کہانی کی شکل میں پیش کرتے ہیں جب کہ کفن اصل میں اردو میں لکھی گئی اور سب سے پہلے جامعہ دسمبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے کچھ ماہ بعد اس کا ہندی ترجمہ کفن ہی کے عنوان سے چاند ۱۹۳۶ء

میں شائع ہوا۔

لہٰذا جب ترجمہ کی ہوئی کہانی ایک نیا موڑ دکھا سکتی ہے تب سوزِ وطن کی اردو کہانیاں ہندی کہانی کی ابتدائی نشو و نما میں اہم رول ادا نہیں کر سکتیں؟

اس صورت کو دیکھتے ہوئے پریم چند کی ہندی اور اردو تخلیقات کے بارے میں نئے سرے سے غور کرنا چاہئے اور ان کے اردو سرمایہ کے ذریعہ ہندی ادب پر اور ہندی سرمایہ کے ذریعہ اُردو ادب پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں اُن پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔"

(डा० कमल किशोर गोयन्का सारिका OCT-79-P-58)

شاید اسی لئے پروفیسر احتشام حسین کی یہ تحریریں ہندی ہی کی ایک کتاب میں نظر آتی ہیں:

"اصل بات کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ اس وقت تک ان کی تخلیقات کے احتساب ان کی فکر کی صداقت اور ان کے مقام کے سلسلے میں ادبی فکر و سوچ کے علاوہ دوسرے قسم کے احساسات سے کام لے کر اس انصاف اور سچائی کو اپنایا نہیں گیا جس کی ضرورت ہے"۔ (یہ جملے ہندی میں تھے راقم الحروف نے ان کا ترجمہ کیا ہے) (پریم چند۔ ڈاکٹر ہیکر وال)

اب تک کی تحقیق کے مطابق ۱۹۷۹ء دوسرے ایڈیشن کے بعد اردو میں کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ ایسا کیوں ہوا اس پر غور کرنے کے بجائے میں نے اس کی اشاعت کی فکر کی۔ دوسرے ایڈیشن کی چھ کہانیوں میں چھٹی کہانی سیر درویش کو خارج کر کے پانچ کہانیوں کے پہلے مجموعے کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ پریم چند کی ولادت کے صد سالہ جشن کے موقع پر اس اشاعت کا نئے سرے سے استقبال کیا جائے گا۔

میں اپنی اس حقیر کوشش کو اس عظیم فن کار کی خدمت میں جو زندۂ جاوید ہے خراجِ عقیدت کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

اظہار تشکر

محترم امرت رائے صاحب کا شکرگزار ہوں جنھوں نے میری گفتگو سے میری لگن کی خوشبو محسوس کر کے انتہائی شفقت اور بزرگی کے ساتھ اس کی اشاعت کی اجازت دی۔

استاد محترم ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب کے پاس سوزِ وطن کا دوسرا ایڈیشن موجود ہے انھوں نے اس کی کمیابی و اہمیت کا احساس دلا کر اشاعت کی راہ سجھائی اور قدم قدم پر مفید مشوروں سے نوازا۔ ان کا شکریہ ادا کرنا بے ادبی ہے۔ میں جو کچھ بھی ہوں محض ان کے قدموں میں بیٹھنے کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس صاحب بڑے استاد کی طرح ہیں ان کی محبتوں و کرم فرمائیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ سوزِ وطن کے سلسلے میں انھوں نے کئی باریک پہلوؤں پر روشنی ڈال کر میری تاریکیوں کو دور کیا۔ صمیم قلب سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

برادرِ بزرگ علی اصغر فاطمی اور بھائی ذو الفقار صدیقی کا شکرگزار ہوں جنھوں نے اشاعت کے مسائل حل کرنے میں مدد فرمائی۔

۶۸ مرزا غالب روڈ
الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

علی احمد فاطمی

فروری ۱۹۸۰

دیباچہ

ہر ایک قوم کا علم ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے۔ جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں، وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینہ میں صورت۔ ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشے میں متوالے ہو رہے تھے۔ اس زمانے کی ادبی یادگار بجز عاشقانہ غزلوں اور چند سفلہ قصّوں کے اور کچھ نہیں۔ دوسرا دور اُسے سمجھنا چاہیئے جب قوم کے نئے اور پُرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاحِ تمدّن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے کے قصص و حکایات زیادہ تر اصلاح اور تجدید ہی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغیت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا ہے اور حُبِّ وطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر اُبھارنے لگے ہیں کیونکر ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور یقین ہے کہ جیوں جیوں ہمارے خیال وسیع ہوتے جائیں گے، اس رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حُبِّ وطن کی عظمت کا نقشہ جمائیں۔

نواب رائے

دنیا کا سب سے انمول رتن

دلفگار ایک پُرخار درخت کے نیچے دامن چاک بیٹھا ہوا خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ وہ حسن کی دیوی یعنی ملکہ دلفریب کا سچا اور جانباز عاشق تھا۔ ان عشاق میں نہیں جو عطر پھلیل میں بس کر اور لباسِ فاخرہ سج کر عاشق کے بھیس میں معشوقیت کا دم بھرتے ہیں بلکہ ان سیدھے سادے بھولے بھالے فدائیوں میں جو کوہ اور بیاباں میں سر ٹکراتے اور نالہ و فریاد مچاتے پھرتے ہیں۔ دلفریب نے اس سے کہا تھا کہ اگر تو میرا سچا عاشق ہے۔ تو جا۔ اور دنیا کی سب سے بیش بہا شے لے کر میرے دربار میں آ۔ تب میں تجھے اپنی غلامی میں قبول کروں گی۔ اگر تجھے وہ چیز نہ ملے تو خبردار! ادھر کا رخ نہ کرنا۔ ورنہ دار پر کھنچوا دونگی۔ دلفگار کو اپنے جذبے کے اظہار کا، شکوہ و شکایات۔ اور جمالِ یار کے دیدار کا مطلق موقع نہ دیا گیا۔ دلفریب نے جونہی یہ فیصلہ

سنایا۔ اس کے چوبداروں نے غریب دلفگار کو دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ اور آج تین دن سے یہ ستم رسیدہ شخص اسی پُرخار درخت کے نیچے اسی وحشت ناک میدان میں بیٹھا ہوا سوچ رہا ہے کہ کیا کروں؟ دنیا کی سب سے بیش بہا شے! ناممکن! اور وہ ہے کیا؟ قارون کا خزانہ؟ آبِ حیات؟ تاجِ خسرو؟ جامِ جم؟ تختِ طاؤس؟ زرِ پرویز؟ نہیں یہ چیزیں ہرگز نہیں دنیا میں ضرور ان سے گراں تر۔ ان سے بھی بیش بہا چیزیں موجود ہیں۔ مگر وہ کیا ہیں؟ کہاں ہیں؟ کیسے ملیں گی؟ یا خدا میری مشکل کیونکر آسان ہوگی!

دلفگار انہیں خیالات میں چکر کھا رہا تھا۔ اور عقل کچھ کام نہ کرتی تھی منیر شامی کو حاتم سا مددگار مل گیا۔ اے کاش کوئی میرا بھی مددگار ہو جاتا اے کاش مجھے بھی اُس چیز کا جو دنیا کی سب سے بیش بہا ہے نام بتلا دیا جاتا بلا سے وہ شے دستیاب نہ ہوتی مگر مجھے اتنا تو معلوم ہو جاتا کہ وہ کس قسم کی چیز ہے۔ میں گھڑے برابر موتی کی کھوج میں جا سکتا ہوں۔ میں سمندر کا نغمہ۔ پتھر کا دل۔ قضا کی آواز۔ اور ان سے بھی زیادہ بے نشان چیزوں کی تلاش میں کمر ہمت باندھ سکتا ہوں۔ مگر دنیا کی سب سے بیش بہا شے یہ میرے پرِ پرواز سے بالا تر ہے۔

آسمان پر تارے نکل آئے تھے۔ دلفگار یکایک خدا کا نام لے کر اٹھا اور ایک طرف کو چل کھڑا ہوا۔ بھوکا پیاسا۔ برہنہ تن خستہ و زار وہ برسوں ویرانوں اور آبادیوں کی خاک چھانتا پھرا۔ تلوے کانٹوں سے چھلنی ہو گئے۔ جسم میں تارِ مسطر کی طرح ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آنے لگیں۔ مگر وہ چیز

جو دنیا کی سب سے بیش بہا شے تھی میسّر نہ ہوئی۔ اور نہ اس کا کچھ نشان ملا
ایک روز بھولتا بھٹکتا ایک میدان میں نکلا۔ جہاں ہزاروں آدمی حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ بیچ میں کئی عمامے اور عباوالے ریشائیل قاضی شان تحکم سے بیٹھے ہوئے باہم کچھ عرفش کر رہے تھے اور اس جماعت سے ذرا دور پر ایک سولی کھڑی تھی۔ دلفگار کچھ ناتوانی کے غلبے سے۔ اور کچھ یہاں کی کیفیت دیکھنے کے ارادے سے ٹھٹک گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ کئی برقنداز ایک دست و پا بزنجیر قیدی کو لئے چلے آرہے ہیں۔ سولی کے قریب پہونچ کر سب سپاہی رک گئے۔ اور قیدی کی ہتھکڑیاں بیڑیاں سب اتار لی گئیں۔ اس بدقسمت شخص کا دامن صدہا بے گناہوں کے خون کے چھینٹوں سے رنگین ہو رہا تھا۔ اور اس کا دل نیکی کے خیال اور رحم کی آواز سے مطلق مانوس نہ تھا۔ اسے کالا چور کہتے تھے۔ سپاہیوں نے اسے سولی کے تختے پر کھڑا کر دیا۔ موت کی پھانسی اس کی گردن میں ڈال دی۔ اور جلادوں نے تختہ کھینچنے کا ارادہ کیا۔ کہ بدقسمت مجرم چیخ کر بولا اللہ مجھے ایک دم کے لئے پھانسی سے اتار دو۔ تاکہ اپنے دل کی آخری آرزو نکال لوں۔ یہ سنتے ہی چاروطرف سناٹا چھا گیا۔ لوگ حیرت میں آکر تاکنے لگے۔ قاضیوں نے ایک مرنے والے شخص کی آخری استدعا کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور بدنصیب سیہ کار کالا چور ذرا دیر کے لئے پھانسی سے اتار لیا گیا۔

اس مجمع میں ایک خوبصورت بھولا بھالا لڑکا ایک چھڑی پر سوار

ہو کر اپنے پیروں پر اچھل اچھل کر فرضی گھوڑا دوڑاتا رہا تھا۔ اور اپنے عالمِ سادگی میں مگن تھا گویا وہ اس وقت واقعی کسی عربی رہوار کا شہسوار ہے اس کا چہرہ اس سچی مسرت سے کنول کی طرح کھلا ہوا تھا جو چند دنوں کے لئے بچپن ہی میں حاصل ہوتی ہے۔ اور جس کی یاد ہم کو مرتے دم تک نہیں بھولتی۔ اس کا سینہ ابھی تک معصیت کے گرد و غبار سے بے لوث تھا۔ اور معصومیت اسے اپنی گود میں کھلا رہی تھی بدقسمت کالا چور پھانسی سے اترا۔ ہزاروں آنکھیں اس پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ اس لڑکے کے پاس آیا اور اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا۔ اسے اس وقت وہ زمانہ یاد آیا جب وہ خود ایسا ہی بھولا بھالا۔ ایسا ہی خوش و خرم۔ اور آلائشات دنیوی سے ایسا ہی پاک و صاف تھا۔ ماں گودیوں میں کھلاتی تھی۔ باپ بلائیں لیتا تھا اور سارا کنبہ جانیں وارا کرتا تھا۔ آہ! کالے چور کے دل پر اس وقت ایامِ گذشتہ کی یاد کا اتنا اثر ہوا کہ اُس کی آنکھوں سے جنھوں نے نیم بسمل لاشوں کو تڑپتے دیکھا۔ اور نہ جھپکی تھیں۔ آنسوں کا ایک قطرہ ٹپک پڑا۔ دلفگار نے لپک کر اس درِ یکتا کو ہاتھ میں لے لیا۔ اور اس کے دل نے کہا بیشک یہ شے دنیا کی سب سے انمول چیز ہے۔ جس پر تختِ طاؤس اور جامِ جم اور آبِ حیات اور زرِ پرویز سب تصدق ہیں۔

اسی خیال سے خوش ہوتا، کامیابی کی امید سے سرمست، دلفگار اپنی معشوقۂ دلفریب کے شہر مینو سواد کو چلا۔ مگر جوں جوں منزلیں

طے ہوتی جاتی تھیں۔ اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ کہ کہیں اس چیز کی جسے میں دنیا کی سب سے بیش بہا چیز سمجھتا ہوں، دلفریب کی نگاہوں میں قدر نہ ہوئی تو میں دار پر کھینچ دیا جاؤں گا۔ اور اس دنیا سے نامراد جاؤں گا پر ہمہ بادا باد۔ اب تو قسمت آزمائی ہے۔ آخر کوہ و دریا طے کرتے شہر مینو سواد میں آپہونچا۔ اور دلفریب کے در دولت پر جاکر التماس کی کہ خستہ وزار دلفگار بفضل خدا تعمیل ارشاد کر کے آیا ہے اور شرف قدم بوسی چاہتا ہے۔ دلفریب نے فی الفور حضور میں بلا بھیجا۔ اور ایک زرنگار پردہ کی اوٹ سے فرمائش کی کہ وہ ہدیہ بیش بہا پیش کرو۔ دلفگار نے ایک عجیب امید و بیم کے عالم میں وہ قطرہ پیش کیا اور اس کی ساری کیفیت نہایت ہی موثر لہجے میں بیان کی۔ دلفریب نے کل روداد بغور سنی۔ اور تحفہ ہاتھ میں لے کر ذرا دیر تک غور کر کے بولی۔" دلفگار بیشک تو نے دنیا کی ایک بیش قیمت چیز ڈھونڈ نکالی۔ تیری ہمت کو آفریں اور تیری فراست کو مرحبا! مگر یہ دنیا کی سب سے بیش قیمت چیز نہیں۔ اس لئے تو یہاں سے جا۔ اور پھر کوشش کر۔ شاید اب کی تیرے ہاتھ دُرِ مقدر لگے۔ اور تیری قسمت میں میری غلامی لکھی ہو۔ اپنے عہد کے مطابق میں تجھے دار پر کھنچوا سکتی ہوں۔ مگر میں تیری جاں بخشی کرتی ہوں اس لئے کہ تجھ میں وہ اوصاف موجود ہیں جو میں اپنے عاشق میں دیکھنا چاہتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تو ضرور کبھی سرخ رو ہوگا۔ ناکام و نامراد دلفگار اس عنایت معشوقانہ سے ذرا دلیر ہو کر بولا۔" اے محبوب دلنشیں

بعد مدتہائے دراز کے تیرے آستان کی جب رسائی نصیب ہوتی ہے۔ پھر خدا جانے ایسے دن کب آئیں گے۔ کیا تو اپنے عاشق جانباز کے حال زار پر ترس نہ کھائے گی اور اپنے جمال جہاں آرا کا جلوہ دکھا کر اس سوختہ تن دلفگار کو آنے والی سختیوں کے جھیلنے کے لئے مستعد نہ بنائے گی۔ تیری ایک نگاہِ مست کے نشہ سے بیخود ہو کر میں وہ کر سکتا ہوں جو آج تک کسی سے نہ ہوا ہو۔ دلفریب عاشق کے یہ اشتیاق آمیز کلمات کو سن کر بر افروختہ ہو گئی اور حکم دیا کہ اس دیوانے کو کھڑے کھڑے دربار سے نکال دو۔ چوبدار نے فوراً غریب دلفگار کو دھکے دے کر کوچۂ یار سے باہر نکال دیا۔

کچھ دیر تک تو دلفگار معشوقانہ ستم کیش کی اس تند خوئی پر آنسو بہاتا رہا۔ بعدازاں سوچنے لگا کہ اب کہاں جاؤں۔ مدتوں کی رہ نوردی و بادیہ پیمائی کے بعد یہ قطرۂ اشک ملا تھا۔ اب ایسی کون سی چیز ہے جس کی قیمت اس دُرِ آبدار سے زائد ہو۔ حضرتِ خضر! تم نے سکندر کو چاہ ظلمات کا راستہ دکھایا تھا۔ کیا میری دستگیری نہ کرو گے؟ سکندر شاہ ہفت کشور تھا۔ میں تو ایک خانماں برباد مسافر ہوں۔ تم نے کتنی ہی ڈوبتی کشتیاں کنارے لگائی ہیں۔ مجھ غریب کا بیڑا بھی پار کرو۔ اے جبرئیل عالی مقام! کچھ تمہیں اس عاشق نیم جان و اسیرِ رنج و محن پر ترس کھاؤ۔ تم مقربان بارگاہ سے ہو۔ کیا میری مشکل آسان نہ کرو گے؟ الغرض دلفگار بیزار نے بہت فریاد مچائی۔ مگر کوئی اس کی دستگیری کے لئے نمودار نہ ہوا۔ آخر مایوس

ہو کر وہ مجنوں صفت دوبارہ ایک طرف کو چل کھڑا ہوا۔
دلفگار نے پورب سے پچھم تک اور اتر سے دکھن تک کتنے ہی دیاروں کی خاک چھانی۔ کبھی برفشانی چوٹیوں پر سویا۔ کبھی ہولناک وادیوں میں بھٹکتا پھرا۔ مگر جس چیز کی دھن تھی وہ نہ ملی۔ یہاں تک کہ اس کا جسم ایک تودۂ استخواں ہو گیا۔
ایک روز وہ شام کے وقت کسی دریا کے کنارے خستہ حال پڑا ہوا تھا۔ نشۂ بے خودی سے چونکا تو کیا دیکھتا ہے کہ صندل کی چِتا بنی ہوئی ہے اور اس پر ایک نازنین شہانے جوڑے پہنے۔ سولہوں سنگار کیے بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے زانو پر اس کے پیارے شوہر کی لاش ہے۔ ہزاروں آدمی حلقہ باندھے کھڑے ہیں۔ اور پھولوں کی برکھا کر رہے ہیں۔ یکایک چتا میں سے خود بخود ایک شعلہ اٹھا۔ ستی کا چہرہ اس وقت ایک پاک جذبے سے منور ہو رہا تھا۔ مبارک شعلے اس کے گلے لپٹ گئے۔ اور دم زدن میں وہ پھول سا جسم تودۂ خاکستر ہو گیا۔ معشوق نے اپنے تئیں عاشق پر نثار کر دیا۔ اور دو فدائیوں کی سچی۔ لافانی اور پاک محبت کا آخری جلوہ نگاہ ظاہر سے پنہاں ہو گیا۔ جب سب لوگ اپنے گھروں کو لوٹے تو دلفگار چپکے سے اٹھا اور اپنے گریبان چاک دامن میں یہ تودۂ خاک سمیٹ لیا۔ اور اس مشتِ خاک کو دنیا کی سب سے گراں بہا چیز سمجھتا ہوا کامرانی کے نشہ میں مخمور کوچۂ یار کی طرف چلا۔ اب کی جوں جوں وہ منزلِ مقصود کے قریب آتا تھا، اس کی ہمتیں بڑھتی جاتی تھیں۔ کوئی اس کے دل میں

بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا اب کی تیری فتح ہے اور اس خیال نے اس کے دل جو جو خواب دکھائے۔ اس کا ذکر فضول ہے۔ آخر وہ شہر مینو سواد میں داخل ہوا۔ اور دلفریب کے آستانِ رفعت نشان پر جاکر خبر دی کہ دلفگار سرخرو اور باوقار لوٹا ہے اور حضوری میں باریاب ہوا چاہتا ہے دلفریب نے عاشق جانباز کو فوراً دربار میں بلایا اور اس چیز کے لئے جو دنیا کی سب سے بیش بہا جنس تھی، ہاتھ پھیلا دیا۔ دلفگار نے جرات کر کے اس ساعدِ سیمیں کا بوسہ لے لیا اور وہ مشتِ خاک اس میں رکھ کر اس ساری کیفیت نہایت دلسوز انداز میں کہہ سنائی۔ اور معشوقہ دلپذیر کے نازک لبوں سے اپنی قسمت کا مبارک اور جانفزا فیصلہ سننے کے لئے منتظر ہو بیٹھا۔ دلفریب نے اس مشتِ خاک کو آنکھوں سے لگا لیا اور کچھ دیر تک دریائے تفکر میں غرق رہنے کے بعد بولی: "اے عاشق جاں نثار دلفگار! بیشک یہ خاک کیمیائے صفت جو تو لایا ہے دنیا کی نہایت بیش قیمت چیز ہے۔ اور میں تیرے صدق دل سے ممنون ہوں کہ تو نے ایسا بیش بہا تحفہ مجھے پیش کش کیا۔ مگر دنیا میں اس سے بھی زیادہ گراں قدر کوئی چیز ہے۔ جا اسے تلاش کر اور تب میرے پاس آ۔ میں تہ دل سے دعا کرتی ہوں کہ خدا تجھے کامیاب کرے۔ یہ کہہ کر وہ پردۂ زرنگار سے باہر آئی۔ اور معشوقانہ ادا سے اپنے جمالِ جاں سوز کا نظارہ دکھا کر پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ایک برق تھی کہ کوندی اور پھر پردۂ ابر میں چھپ گئی۔ ابھی دلفگار کے حواس بجا نہ ہونے پائے

سکتے کہ چوبدار نے ملائمت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کوچۂ یار سے نکال دیا۔ اور پھر تیسری بار وہ بندۂ محبت۔ وہ زاویہ نشینِ کُنجِ ناکامی یاس کے اتھاہ سمندر میں غوطہ کھانے لگا۔

دلفگار کا ہاتھوں چھوٹ گیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ میں دنیا میں ناشاد و نامراد مر جانے کے لئے پیدا کیا گیا تھا اور اب بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ کسی پہاڑ پر چڑھ کر اپنے تئیں گرا دوں۔ تاکہ معشوق کی جفا کاریوں کی لئے ایک ریزہ استخواں بھی باقی نہ رہے۔ وہ دیوانہ وار اٹھا اور افتاں وخیزاں ایک سربفلک کوہ کی چوٹی پر جا پہنچا۔ کسی اور وقت وہ ایسے اونچے پہاڑ پر چڑھنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا مگر اس وقت جان دینے کے جوش میں اسے وہ پہاڑ ایک معمولی ٹیکرے سے زیادہ اونچا نہ نظر آیا۔ قریب تھا کہ وہ نیچے کود پڑے کہ ایک سبز پوش پیر مرد۔ سبز عمامہ باندھے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے ہاتھ میں عصا لئے برآمد ہوئے۔ اور ہمت افزا لہجے میں بولے "دلفگار! نادان دلفگار! یہ کیا بزدلانہ حرکت ہے؟ استقلال راہِ عشق کی پہلی منزل ہے۔ باایں‌ہمہ ادعائے عاشقی تجھے اتنی بھی خبر نہیں۔ مرد بن۔ اور یوں ہمت نہ ہار۔ مشرق کی طرف ایک ملک ہے جس کا نام ہندوستان ہے۔ وہاں جا۔ اور تیری آرزو پوری ہوگی"۔ یہ کہہ کر حضرتِ خضر غائب ہوگئے۔ دلفگار نے شکریہ کی نماز ادا کی۔ اور تازہ حوصلے۔ تازہ جوش اور غیبی امداد کا سہارا پاکر خوش خوش پہاڑ سے اترا اور جانب ہند مراجعت کی۔

لہ حوصلہ۔

مدتوں تک پر خار جنگلوں۔ شرر بار ریگستانوں۔ دشوار گزار وادیوں اور ناقابلِ عبور پہاڑوں کو طے کرنے کے بعد دلفگار ہند کی پاک سرزمین میں داخل ہوا۔ اور ایک خوشگوار چشمہ میں سفر کی کلفتیں دھو کر غلبۂ ماندگی سے لب جو یبار لیٹ گیا۔ شام ہوتے ہوتے وہ ایک کفِ دست میدان میں پہونچا جہاں بیشمار نیم کشتہ اور بے جان لاشیں بے گور و کفن پڑی ہوئی تھیں۔ زاغ و زغن اور وحشی درندوں کی گرم بازاری تھی۔ اور سارا میدان خون سے شنگرف ہو رہا تھا۔ یہ ہیبت ناک نظارہ دیکھتے ہی دلفگار کا جی دہل گیا۔ خدایا! کس عذاب میں جان پھنسی۔ مرنے والوں کا کراہنا۔ سسکنا۔ اور ایڑیاں رگڑ کر جان دینا۔ درندوں کو ہڈیوں کو نوچنا اور گوشت کے لوتھڑوں کو لے کر بھاگنا۔ ایسا ہولناک سین دلفگار نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یکایک اسے خیال آیا۔ میدان کارزار ہے اور یہ لاشیں سورما سپاہیوں کی ہیں اتنے میں قریب سے کراہنے کی آواز آئی۔ دلفگار اس طرف پھرا تو دیکھا کہ ایک قوی ہیکل شخص۔ جس کا مردانہ چہرہ ضعف جانکندنی سے زرد ہو گیا ہے زمین پر سرنگوں پڑا ہوا ہے۔ سینے سے خون کا فوارہ جاری ہے۔ مگر شمشیر آبدار کا قبضہ پنجے سے الگ نہیں ہوا۔ دلفگار نے ایک چیتھڑا لے کر دہان زخم پر رکھ دیا تاکہ خون رک جائے اور بولا: "اے جوانمرد تو کون ہے؟" جوانمرد نے یہ سن کر آنکھیں کھولیں اور دلیرانہ لہجہ میں بولا "کیا تو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔ کیا تو نے آج اس تلوار کی کاٹ نہیں دیکھی؟ میں اپنی ماں کا بیٹا اور بھارت کا لختِ جگر ہوں۔" یہ کہتے کہتے اس کے تیوروں

پر بل پڑ گئے۔ زرد چہرہ خشمگیں ہو گیا۔ اور شمشیر آبدار پھر اپنا جوہر دکھانے کے لئے چمک اٹھی۔ دلفگار سمجھ گیا کہ یہ اس وقت مجھے دشمن خیال کر رہا ہے۔ ملائمت سے بولا: اے جوانمرد! میں تیرا دشمن نہیں ہوں۔ ایک آوارہ وطن غربت زدہ مسافر ہوں۔ ادھر بھولتا بھٹکتا آنکلا۔ براہِ کرم مجھ سے یہاں کی مفصل کیفیت بیان کر۔" یہ سنتے ہی زخمی سپاہی نہایت شیریں لہجہ میں بولا۔" اگر تو مسافر ہے تو آ۔ اور میرے خون سے تر پہلو میں بیٹھ جا۔ کیونکہ یہی دو انگل زمین ہے جو میرے پاس باقی رہ گئی ہے اور جو سوائے موت کے کوئی نہیں چھین سکتا۔ افسوس ہے کہ تو یہاں ایسے وقت میں آیا۔ جب ہم تیری مہمان نوازی کرنے کے قابل نہیں۔ ہمارے باپ دادا کا دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اور اس وقت ہم بے وطن ہیں۔ مگر (پہلو بدل کر) ہم نے حملہ آور غنیم کو بتا دیا کہ راجپوت اپنے دیس کے لئے کیسی بے جگری سے جان دیتا ہے۔ یہ آس پاس جو لاشیں تو دیکھ رہا ہے۔ یہ ان لوگوں کی ہیں جو اس تلوار کے گھاٹ اترے ہیں (مسکرا کر) اور گو کہ میں بے وطن ہوں۔ مگر غنیمت ہے کہ حریف کے حلقہ میں مر رہا ہوں۔ (سینے کے زخم سے چیتھڑا نکال کر) کیا تو نے یہ مرہم رکھ دیا۔ خون نکلنے دے۔ اسے روکنے سے کیا فائدہ؟ کیا میں اپنے ہی وطن میں غلامی کرنے کے لئے زندہ رہوں؟ نہیں ایسی زندگی سے مرنا اچھا۔ اس سے بہتر موت ممکن نہیں۔"

جوانمرد کی آواز مدہم ہو گئی۔ اعضا ڈھیلے ہو گئے۔ خون اس کثرت

سے بہا کر اب خود بخود بند ہو گیا۔ رہ رہ کر ایک آدھ قطرہ ٹپک پڑتا تھا۔ آخر کار سارا جسم بیدم ہو گیا۔ قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ اور آنکھیں مُند گئیں۔ دلفگار نے سمجھا اب کام تمام ہو گیا کہ مرنے والے نے آہستہ سے کہا۔ "بھارت ماتا کی جے" اور اس کے سینہ سے آخری قطرہ خون نکل پڑا ایک سچے محب وطن اور دیس بھگت نے حب الوطنی کا حق ادا کر دیا۔ دلفگار اس نظارہ سے بیحد متاثر ہوا۔ اور اس کے دل نے کہا بیشک دنیا میں اس قطرۂ خون سے بیش قیمت شے نہیں ہو سکتی۔ اس نے فوراً اس رشک لعل رمّانی کو ہاتھ میں لے لیا۔ اور اس دلیر راجپوت کی بسالت پر تحسین کرتا ہوا عازم وطن ہوا۔ اور وہی سختیاں جھیلتا ہوا بالآخر ایک مدت دراز میں ملکہ اقلیم خوبی اور دُرِّ صدف محبوبی کے درِ دولت پر جا پہونچا اور پیغام دیا کہ دلفگار سرخرو و کامگار لوٹا ہے اور دربار گہر بار میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔ دلفریب نے اسے فوراً حاضر ہونے کا حکم دیا۔ خود حسب معمول پردۂ زرنگار کے پسِ پشت بیٹھی اور بولی "دلفگار! اب کی تو بہت دنوں کے بعد واپس آیا ہے۔ لا۔ دنیا کی سب سے بیش قیمت چیز کہاں ہے؟ دلفگار نے پنجۂ رعنائی کا بوسہ لے کر وہ قطرۂ خون اس پر رکھ دیا۔ اور اس مشرح کیفیت پُرجوش لہجے میں کہہ سنائی۔ وہ خاموش بھی نہ ہونے پایا تھا کہ یکایک وہ پردۂ زرنگار ہٹ گیا اور دلفگار کے روبرو ایک دربارِ حسن آراستہ نظر آیا۔ جس ایک ایک نازنین رشکِ زلیخا تھی۔ دلفریب بصد شان رعنائی مسند زریں کار پر جلوہ افروز تھی۔ دلفگار یہ

طلسمِ حسن دیکھ کر متحیر ہو گیا۔ اور نقش دیوار کی طرح سکتے میں آگیا۔ کہ دلفریب مسند سے اٹھی اور کئی قدم آگے بڑھ کر اس کے ہم آغوش ہو گئی۔ رقاصانِ دلنواز نے شادیانے گانے شروع کئے۔ حاشیہ نشینانِ دربار نے دلفگار کو نذریں گذرانیں۔ اور ماہ و خورشید کو بہ عزت تمام مسند پر بٹھا دیا جب نغمۂ دل پسند بند ہوا تو دلفریب کھڑی ہو گئی۔ اور دست بستہ ہو کر دلفگار سے بولی "اے عاشق جاں نثار دلفگار! میری دعائیں تیر بہدف ہوئیں اور خدا نے میری سن لی اور تجھے کامیاب و سرخرو کیا۔ آج سے تو میرا آقا ہے اور میں تیری کنیز ناچیز۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک مرصع صندوقچہ منگایا اور اس میں سے ایک لوح نکالا جس پر آبِ زر سے لکھا ہوا تھا۔

"وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے، دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔"

شیخ مخمور

مُلک جنت نشان کی تاریخ میں وہ بہت تاریک زمانہ تھا جب شاہ کشور
کی فتوحات کا سیلاب بڑے زور شور کے ساتھ اُس پر آیا۔ سارا ملک پامال
ہوگیا۔ آزادی کی عمارتیں ڈھے گئیں اور جان و مال کے لالے پڑ گئے۔ شاہ بامراد
خوب جی کھول کر لڑا۔ خوب داد شجاعت دی۔ اور اپنے خاندان کے تین لاکھ
سورماؤں کو اپنے ملک پر قربان کر دیا۔ مگر فاتح کی شمشیر خارا شگاف کے
مقابلے میں اس کی یہ مردانہ جان بازیاں بے اثر ثابت ہوئیں۔ ملک پر
شاہ کشور کشا کی حکومت کا سکہ جم گیا۔ اور شاہ بامراد یکہ و تنہا بے یار و مدگار
اپنا سب کچھ آزادی کے نام پر قربان کر کے ایک جھونپڑے میں زندگی بسر
کرنے لگا۔

یہ جھونپڑا کوہستانی مقام پر واقع تھا۔ آس پاس جنگلی قومیں آباد

تھیں اور دور دور تک پہاڑوں کے سلسلے نظر آتے تھے۔ اس سنسان جگہ میں شاہ بامراد ایامِ مصیبت کاٹنے لگا۔ دنیا میں اب اس کا کوئی رفیق نہ تھا۔ وہ دن بھر آبادی سے دور ایک چٹان پر اپنے خیال میں مست بیٹھا رہتا تھا۔ لوگ سمجھتے کہ یہ کوئی شراب عرفان کا مخمور ہے۔ شاہ بامراد کو یوں گزران کرتے ایک زمانہ گذر گیا۔ اور شباب کی الوداع اور پیری کے خیر مقدم کے سامان ہونے لگے ؞

تب ایک روز شاہ بے مراد بستی کے سردار کے پاس گیا اور اس سے کہا میں اپنی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی جانب سے یہ پیغام سن کر وہ متعجب ہوگیا۔ مگر چونکہ دل میں شاہ صاحب کے کمال و فقر کا معتقد تھا ردِ سوال نہ کر سکا اور اپنی دوشیزہ، نوجوان بیٹی ان کے نذر کی۔ تیسرے سال اس نازنین کے گلشنِ مراد میں ایک نورس پودا اگا۔ شاہ صاحب فرطِ مسرت سے جامہ میں پھولے نہ سمائے۔ بچہ کو گود میں اٹھالیا۔ اور حیرت میں ڈوبی ہوئی ماں کے روبرو پُرجوش لہجے میں بولے "خدا کا شکر ہے ملک جنت نشان کا وارث پیدا ہوا ؞

بچہ بڑھنے لگا۔ فہم و ذکاوت میں، ہمت و طاقت میں وہ اپنی دوگنی عمر کے بچوں سے بڑھ کر تھا۔ صبح ہوتے ہی غریب رنڈہ بچے کا بناؤ سنگار کر کے اور اسے ناشتہ کھلا کر اپنے کام دھندے میں مصروف ہوجاتی تھی اور شاہ صاحب بچے کی انگلی پکڑ کر اُسی آبادی سے دور چٹان پر لے جاتے۔ وہاں کبھی اسے پڑھاتے، کبھی فنون حرب کی مشق کراتے

اور کبھی اسے قوانینِ شاہی سمجھاتے۔ بچہ تھا تو کم سن۔ مگر ان باتوں میں ایسا جی لگاتا۔ اور ایسے شوق سے مصروف رہتا گویا اسے اپنے حسب و نسب کا حال معلوم ہے۔ مزاج بھی اس کا شاہانہ واقع ہوا تھا۔ گاؤں کا ایک ایک لڑکا اس کے حکم کا فرمانبردار تھا۔ ماں اس پر فخر کرتی باپ پھولا نہ سماتا اور سارے گاؤں کے لوگ سمجھتے کہ یہ شاہ صاحب کے کشف و کرامات کا اثر ہے ؛

بچہ مسعود دیکھتے دیکھتے ایک ہفت سالہ نوجوان شہزادہ ہوگیا اسے دیکھ کر دیکھنے والے کے دل میں سرور ہوتا تھا۔ ایک روز شام کا وقت تھا۔ شاہ صاحب تنہا سیر کرنے گئے اور جب لوٹے تو ان کے سر پر ایک تاج مرصع زیب دے رہا تھا۔ رندہ ان کی یہ ہیئت دیکھ کر سہم گئی اور منہ سے کچھ بول نہ سکی۔ تب انھوں نے نوجوان مسعود کو گلے سے لگایا۔ اسے اسی وقت نہلایا، دھلایا۔ اور اپنے چٹان کے تخت پر بیٹھا کر رقت آمیز لہجے میں بولے مسعود! میں آج تم سے رخصت ہوتا ہوں اور تمہاری امانت تمہیں سونپتا ہوں۔ یہ اسی ملک جنت نشان کا تاج ہے۔ کوئی وہ زمانہ تھا کہ یہ تاج تمہارے بدنصیب باپ کے سر پر زیب دیتا تھا۔ اب وہ تمہیں مبارک ہو۔ رندہ پیاری بیوی! تیرا بدقسمت شوہر کسی زمانے میں اس ملک کا فرمانبردار تھا اور اب تو اس کی ملک ہے۔ میں نے یہ راز تم سے اب تک چھپایا تھا۔ مگر ہماری فرقت کا زمانہ بہت قریب ہے۔ اب چھپا کر کیا کروں۔ مسعود! تم ابھی بچے ہو مگر دلیر اور ذی فہم ہو۔ مجھے یقین ہے

کہ تم اپنے بوڑھے باپ کی آخری وصیت پر دھیان دوگے۔ اوراس پر عمل کرنے کی کوشش کروگے۔ یہ ملک تمہارا ہے، یہ تاج تمہارا ہے اور یہ رعایا تمہاری ہے۔ تم انہیں اپنے قبضے میں لانے کی مرتے دم تک کوشش کرتے رہنا اور اگر تمہاری تمام کوششیں ناکام ہو جائیں اور تمہیں بھی یہی بے سروسامانی کی موت نصیب ہو تو یہی وصیت تم اپنے فرزندِ دلبند سے کر دینا۔ اور یہ تاج جو اس کی امانت ہوگی، اس کے سپرد کرنا۔ مجھے تم سے اور کچھ نہیں کہنا۔ خدا تم دونوں کو خوش و خرم رکھے اور تمہیں مراد کو پہنچائے"۔

یہ کہتے کہتے شاہ صاحب کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ رندہ دوڑ کر ان کے کے پیروں سے لپٹ گئی اور مسعود گریہ وزاری کرنے لگا۔ دوسرے دن صبح کو گاؤں کے لوگ جمع ہوئے اور ایک کوہستانی غار کے آغوش میں لاش کو رکھ دی۔

(۲)

شاہ کشور کشا نے نصف صدی تک خوب عدل و انصاف سے سلطنت کی مگر کشور کشا ثانی نے تخت پر آتے ہی اپنے عقلمند باپ کے مشیروں کو یک قلم برخاست کر دیا اور اپنی مرضی کے موافق نئے نئے وزیر و مشیر مامور کیے۔ کارِ سلطنت روز بروز بگڑنے لگا۔ سرداروں نے بے انصافی پر کمر باندھی اور عمال رعایا پر جور و جبر کرنے لگے۔ یہاں تک کہ خاندان مرادیہ کے ایک نمک خوار قدیم نے موقع اچھا دیکھ کر عَلَمِ بغاوت بلند

کر دیا۔ اطراف سے لوگ اس کے زیرِ علم جمع ہونے لگے اور چند ہفتوں میں ایک فوجِ کثیر قائم ہو گئی اور مسعود بھی سردار نمک خوار کی فوج میں آکر معمولی سپاہیوں کا کام انجام دینے لگا۔

مسعود کا اس وقت عنفوان شباب تھا۔ دل میں مردانہ جوش اور بازوؤں میں شیروں کی قوت موجود تھی۔ ایسا وجیہ اور کشیدہ قامت جوان رعنا بہت کم کسی نے دیکھا ہوگا۔ شیروں کے شکار کا اسے عشق تھا۔ دور دور تک کے جنگل درندوں سے خالی ہو گئے۔ سویرے سے شام تک اسے بجز سیر اور شکار کے اور کوئی دھندا نہ تھا۔ لب و لہجہ ایسا دلکش پایا تھا کہ جس وقت سرور میں آکر کوئی قومی نغمہ چھیڑ دیتا تو راہ چلتے مسافروں اور پہاڑی عورتوں کا ایک اژدحام لگ جاتا تھا۔ کتنے ہی بھولے بھالے دلوں پر اس کی موہنی صورت نقش تھی۔ کتنی ہی آنکھیں اس کے دیدار کو ترستیں اور کتنی ہی جانیں اس کے سوزِ محبت میں کھلتی تھیں۔ مگر مسعود پر ابھی تک کسی کا جادو نہ چلا تھا۔ ہاں اگر اسے محبت تھی تو اپنی شمشیرِ آبدار سے جو اس نے باپ سے ورثہ میں پائی تھی۔ اس تیغ کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا۔ بیچارہ خود برہنہ تن رہتا۔ مگر اس کے لئے انواع و اقسام کے میان بنوائے تھے۔ اسے ایک دم کے لئے اپنے پہلو سے جدا نہ کرتا۔ سچ ہے ایک دلیر سپاہی کی تلوار اس کی نگاہوں میں دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ خصوصاً وہ خنجرِ آبدار جس کا جوہر متعدد موقعوں پر پرکھا جا چکا ہو۔ اسی تیغ سے مسعود نے کتنے ہی وحشی درندوں کو

ہلاک کیا تھا۔ کتنے ہی لیٹروں اور رہزنوں کو شربت مرگ چکھایا تھا۔ اور اسے یقینِ کامل تھا کہ یہی تلوار کسی دن کشورکشا ثانی کے سر پر چمکے گی۔ اور اس کی شہرگ کے خون سے اپنی زبان ترکرے گی ؟

ایک روز ایک شیر کے تعاقب میں بہت دور نکل گیا۔ دھوپ سخت تھی۔ بھوک اور پیاس سے جی بیتاب ہوا۔ مگر وہاں نہ تو کوئی میوے کا درخت نہ کوئی رواں چشمہ نظر آیا۔ جس سے بھوک و پیاس کی آگ بجھاتا۔ حیران و پریشان کھڑا تھا کہ سامنے سے ایک مہوش نازنین ہاتھ میں نیزہ لئے اور اسپ برق رفتار پر سوار آتی ہوئی دکھائی دی۔ پسینوں کے موتی کے سے قطرے اس کی پیشانی پر نمودار تھے۔ اور گیسوے عنبریں دونوں شانوں پر ایک دلپذیر بے تکلفی سے بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور مسعود کا دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس غریب نے آج تک ایسا جمالِ جہاں سوز نہ دیکھا تھا۔ اس پر ایک سکوت کا عالم طاری ہوگیا یہ نازنین اس دیار میں ملکۂ شیر افگن کے نام سے مشہور تھی ؟

ملکہ نے مسعود کو دیکھ کر گھوڑے کی باگ کھینچ لی اور تند لہجے میں بولی۔ "کیا تو وہی نوجوان ہے جو میرے علاقے کے شیروں کا شکار کیا کرتا ہے؟ بتلا تیری اس گستاخی کی کیا سزا دوں۔" یہ سنتے ہی مسعود کی آنکھیں سرخ ہوگئیں اور بے اختیار ہاتھ دستۂ تیغ پر جا پہنچا۔ مگر ضبط کرکے بولا۔ "اس سوال کا جواب میں خوب دیتا اگر بجائے آپ کے وہ کسی دلیر مرد کی زبان سے نکلتا۔" ان الفاظ نے ملکہ کو اور بھی برانگیختہ کر

دیا۔ اس نے گھوڑے کو چمکایا اور نیزہ اچھالتی سر پر آپہنچی اور وار پر وار کرنے شروع کئے۔ مسعود کے ہاتھ پاؤں شدت تکان سے شل ہو رہے تھے اور ملکہ شیر افگن فن نیزہ بازی میں فرد تھی۔ اس نے پیہم چر کے پر چرکے لگائے یہاں تک کر مسعود زخمی ہو کر گھوڑے سے نیچے گر پڑا۔ اس نے اب تک بجز ملکہ کے واروں کو کاٹنے کے خود ایک ہاتھ بھی نہ چلایا تھا ۞

تب ملکہ گھوڑے سے کودی اور اپنا رومال پھاڑ پھاڑ کر مسعود کے زخم باندھنے لگی۔ ایسا دلیر اور غیور جوانمرد اس کی نظر سے آج تک نہ گذرا تھا۔ وہ اسے با آرام تمام اٹھوا کر اپنے خیمے میں لائی اور دو ہفتے تک اس کی عیادت میں مصروف رہی۔ یہاں تک کہ زخم انگور ہو گئے اور مسعود کا چہرہ پھر بدر کامل کی طرح چمکنے لگا۔ مگر حسرت یہ تھی کہ اب ملکہ نے اس کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا ۞

ایک روز ملکہ شیر افگن نے مسعود کو دربار میں بلایا اور یوں ہمکلام ہوئی "اے مغرور نوجوان! خدا کا شکر ہے کہ تو میرے نوکِ سنان کے زخموں سے صحت پا گیا۔ اب میرے علاقے سے جا تیری گستاخی معاف کرتی ہوں۔ مگر آئندہ میرے علاقے میں شکار کے لئے آنے کی جرات نہ کرنا۔ فی الحال تاکیداً تیری تلوار چھین لی جائے گی۔ تاکہ تو نشۂ نخوت سے مخمور ہو کر پھر ادھر قدم بڑھانے کی ہمت نہ کرے ۞

مسعود نے شمشیر برہنہ نیام سے کھینچ لی اور کڑک کر بولا "جب تک میرے دم میں دم ہے کوئی یہ تلوار مجھ سے نہیں لے سکتا۔" یہ

سنتے ہی ایک قوی ہیکل دیو قامت پہلوان للکار کر بڑھا اور مسعود کی کلائی پر تیغ کا تلا ہوا ہاتھ چلایا۔ مسعود نے وار خالی دیا اور سنبھل کر تیغ کا وار کیا تو پہلوان کی گردن کا تسمہ تک باقی نہ رہا۔ یہ کیفیت دیکھتے ہی ملکہ کی آنکھوں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ غضب ناک لہجے میں بولی "خبردار یہ شخص یہاں سے زندہ نہ جانے پائے۔" چو طرفہ سے نبرد آزمایانِ پختہ کار پل پڑے اور مسعود پر تلواروں اور نیزوں کی بوچھار ہونے لگی۔

مسعود کا جسم زخموں سے چھلنی ہو گیا۔ خون کے پھوارے جاری تھے۔ اور خون کی پیاسی تلواریں زبان کھولے بار بار اس کی طرف لپکتی تھیں اور اس کا خون چاٹ کر شاد کام ہو جاتی تھیں۔ کتنی ہی تلواریں اس کی سپر سے ٹکرا کر ٹوٹ گئیں۔ کتنے ہی دلاورانِ سرفروش زخمی ہو کر تڑپنے لگے اور کتنے ہی راہیٔ عدم ہو گئے۔ مگر مسعود کے ہاتھ میں شمشیرِ آبدار یوں کی توں برق کی طرح کوندتی اور سٹرا اُڑ کرتی رہی۔ یہاں تک کہ پُرفن ملکہ نے خود نعرۂ تحسین بلند کیا اور اس کے تیغ کا بوسہ لے کر بولی۔ "مسعود تو بحرِ بسالت کا نہنگ ہے۔ شیروں کے شکار میں تضیع اوقات مت کر۔ دنیا میں شکار کے علاوہ اور بھی ایسے موقع ہیں جہاں تو اپنے تیغ آبدار کا جوہر دکھا سکتا ہے۔ جا۔ اور ملک و قوم کی خدمت کر۔ سیر و شکار ہم جیسی عورتوں کے لئے چھوڑ دے۔" مسعود کے دل نے گدگدایا۔ کلام شوق زبان تک آیا۔ مگر باہر نہ نکل سکا اور اسی وقت وہ اپنے جگر میں ناوک مژگان کی خلش لئے ہوئے تین ہفتوں کے بعد اپنی بیقرار ماں کے قدموں پر جا گرا۔

(۳)

سردار نمک خوار کی فوج روز بروز بڑھنے لگی۔ پہلے تو وہ تاریکی کے پردے میں خزائن شاہی پر ہاتھ بڑھاتا رہا۔ رفتہ رفتہ ایک باقاعدہ فوج تیار ہو گئی۔ یہاں تک کہ سردار کو افواج شاہی کے مقابلے میں شمشیر آزمائی کا حوصلہ ہوا اور پہلی ہی لڑائی میں چوبیس قلعے اس نئی فوج کے ہاتھ آگئے۔ فوج شاہی نے لڑنے میں مطلق دریغ نہ کیا۔ مگر وہ طاقت، وہ جذبہ، وہ جوش جو سردار نمک خوار اور اس کے رفقاء کے دلوں کو میدان ہمت میں آگے بڑھاتا رہتا تھا۔ کشور کشا ثانی کے سپاہیوں میں معدوم تھا۔ فنون جنگ آوری، خوبی اسلحہ اور ظاہری تزک و احتشام کے لحاظ سے دونوں فوجوں میں کوئی مقابلہ نہ تھا۔ بادشاہ کے سپاہی لحیم و شحیم، توانا و تنومند اور کارآزمودہ تھے ان کے ساز و سامان اور اور طور و طریق سے دیکھنے والوں کے دلوں پر ایک ہیبت طاری ہوتی تھی اور وہم بھی گمان نہ کر سکتا تھا کہ اس زبردست جماعت کے مقابلے میں نیم مسلح، نیم برہنہ اور بے قاعدہ سرداری فوج ایک لمحہ تک بھی قدم جما سکے گی۔ مگر جس وقت "بزن" کی دل بڑھانے والی صدا ہوا میں گونجی، ایک عجیب و غریب نظارہ پیش نظر ہو گیا۔ سردار کے سپاہی تو نعرے مار کر آگے دھاوا کرتے تھے اور سپاہ قیصری راہ گریز پر ایک دبی ہوئی نگاہیں ڈالتی تھی۔ دم زدن میں مورچے غبار کی طرح پھٹ گئے۔ اور جب مسقاط کے مضبوط قلعے میں سردار نمک خوار شاہی قلعہ دار کی مسند پر

ایرانہ گرد فرسے بیٹھا اور اپنی سپاہ کی کارگزاریوں اور جانبازیوں کی داد دینے کے لئے ایک تشت میں طلائی تمغے منگوا کر رکھے تو سب سے پہلے جس سپاہی کا نام پکارا گیا وہ نوجوان مسعود تھا۔

مسعود اس وقت اپنی فوج کا مایۂ ناز تھا۔ میدانِ جنگ میں سب سے پہلے اسی کی تلوار چمکتی تھی اور دھاوے کے وقت سب سے پہلے اسی کے قدم اٹھتے تھے۔ غنیم کے مورچوں میں ایسی بے باکی سے گھستا تھا جیسے آسمان میں شہابِ ثاقب۔ اس کی تلوار کے وار قیامت تھے۔ اور اس کا نشانہ تیرِ پیامِ مرگ۔

مگر چرخِ کج رفتار سے اس کا یہ اعزاز و وقار نہ دیکھا گیا۔ چند افسرانِ آزمودہ کار جن کے تیغوں کی چمک مسعود کے تیغہ کے سامنے ماند پڑ گئی تھی، اس سے خار کھانے لگے تھے اور اسے مٹا دینے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ سوءِ اتفاق سے انھیں موقع بھی جلد ہاتھ آگیا۔

کشور کشا ثانی نے باغیوں کی سرزنش کے لئے اب کی ایک جرّار فوج روانہ کی اور میر شجاع کو اس کا سپہ سالار، جو میدان کارزار میں اپنے وقت کا اسفندیار تھا۔ سردار نمک خوار نے یہ خبر پائی۔ تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میر شجاع کے مقابلے میں آنا شکست کی دعوت کرنا تھا۔ بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ اس خطے سے آبادی کا نشان مٹا کر ہم لوگ قلعہ بند ہو جائیں۔ اس وقت نوجوان مسعود نے اٹھ کر بڑے پرجوش لہجے میں کہا:

"نہیں ہم قلعہ بند نہ ہوں گے، ہم میدان میں رہیں گے اور دست

بدست دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ ہمارے سینے کی ہڈیاں ایسی کمزور نہیں ہیں کہ تیرو تفنگ کے نشانے نہ برداشت کرسکیں۔ قلعہ بند ہونا اس بات کا اعلان ہے کہ ہم دو بدو نہیں لڑ سکتے۔ کیا آپ لوگ جو شاہ بامراد کے نام لیوا ہیں، بھول گئے کہ اسی ملک پر اس نے اپنے خاندان کے تین لاکھ سپوتوں کو پھول کی طرح نثار کر دیا؟ نہیں! ہم ہرگز قلعہ بند نہ ہوں گے۔ ہم دشمن کے مقابلے میں خم ٹھونک کر آئیں گے اور اگر خدا منصف ہے تو ضرور ہماری تلواریں دشمنوں سے گلے ملیں گی اور ہمارے نیزے ان سے ہم آغوش ہوں گے۔"

صدہا نگاہیں مسعود کے پُر جوش چہرے کی طرف اٹھ گئیں۔ سرداروں کے تیوروں پر بل پڑ گئے اور سپاہیوں کے سینے جوش سے دھڑکنے لگے سردار نمک خوار نے اسے گلے سے لگا لیا اور بولے۔ مسعود تیری ہمت اور حوصلے کو آفریں۔ تو ہماری فوج کے لئے باعثِ فخر ہے۔ تیری صلاح مردانہ صلاح ہے۔ بیشک ہم قلعہ بند نہ ہوں گے۔ ہم دشمن کے مقابلے میں خم ٹھونک کر آئیں گے اور اپنے پیارے جنت نشان کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہائیں گے۔ تو ہمارے لئے مشعل رہبر ہے اور ہم سب آج اسی روشنی میں قدم آگے بڑھائیں گے۔

مسعود نے چنے ہوئے سپاہیوں کا ایک دستہ تیار کیا اور کچھ اس دم خم اور کچھ اس جوش خروش سے میر شجاع پر ٹوٹا کہ اس کی ساری فوج میں کھلبلی پڑ گئی۔ سردار نمک خوار نے جب دیکھا کہ سپاہِ قیصری کے

قدم ڈگمگا رہے ہیں تو اپنی پوری جماعت سے برق و باد کی طرح لپکا۔ اور تیغوں سے تیغے اور نیزوں سے نیزے کھڑکنے لگے۔ تین گھنٹے تک ایک شورِ محشر بپا تھا۔ یہاں تک کہ سپاہِ قیصری کے قدم اکھڑ گئے اور وہ سپاہی جس کی تلوار میر شجاع کی گلوگیر ہوئی، مسعود تھا۔

تب سرداری فوج اور افسر سب کے سب مالِ غنیمت پر ٹوٹے اور مسعود زخموں سے چور اور خون میں رنگا ہوا اپنے چند جانباز رفیقوں کے ساتھ قلعۂ مسقاط کی طرف لوٹا۔ مگر جب ہوش نے آنکھیں کھولیں اور حواس بجا ہوئے تو کیا دیکھتا ہے کہ میں ایک آراستہ کمرے میں مخملی گدے پر لیٹا ہوا ہوں۔ پھولوں کی دلآویز مہک اور ماہرویاں سرو قد کے جمگھٹ سے کمرہ تختۂ چمن بنا ہوا تھا۔ نظر استعجاب سے ادھر ادھر تاکنے لگا کہ اتنے میں ایک پری وش۔ گل اندام نازنین طشت میں پھولوں کا ہار رکھے خراماں خراماں آئی ہوئی دکھائی دی۔ گویا بہار پھولوں کی ڈالی پیش کرنے آ رہی ہے۔ اسے دیکھتے ہی ماہرویان سرو قد نے آنکھیں فرشِ راہ کیں اور اس کے دستِ حنائی کے بوسے لئے۔ مسعود دیکھتے ہی پہچان گیا۔ یہ ملکہ شیر افگن تھی۔

ملکہ نے پھولوں کا ہار مسعود کے گلے میں ڈالا۔ زر و جواہر اس پر نثار کئے اور مسند زر نگار پر جلوہ افروز ہو گئی۔ سازندوں نے بین لے کر فاتح مہمان کی خیر مقدم میں دلکش نغمے الاپنے شروع کئے۔

یہاں تو عیش و طرب کے جلسے تھے۔ ادھر رشک خانہ برانداز نے

نئے شگوفے کھلائے۔ سردار سے شکایت کی کہ مسعود ضرور حریف سے جا ملا ہے اور مصلحتاً ایک دستہ فوج لے کر لڑنے کو گیا تھا تاکہ اسے خاک و خون میں ملا کر سرداری فوج کو بے چراغ کر دے۔ اس کی شہادت میں چند نقلی خطوط بھی دکھائے اور اس کینہ کوشش میں ایسی چرب زبانی سے کام لیا۔ کہ آخر سردار کو ان باتوں پر یقین آگیا۔ جب علی الصباح مسعود ملکہ شیر افگن کے دربار سے فتح کا ہار ڈالے سردار کو مبارکباد دینے گیا تو بجائے اس کے کہ قدر دانی کا خلعت اور جانبازی کا تمغہ پاے۔ وہاں تیرِ ملامت کا نشانہ بنایا گیا اور اسے حکم ملا کہ تلوار کمر سے کھول کر رکھدے ۔

مسعود دم بخود رہ گیا۔ یہ تیغہ میں پدر بزرگوار سے ورثہ میں پایا ہے اور یہ میری گذشتہ عظمت کی آخری یادگار ہے۔ یہ میرا قوت بازو اور میرا معین و مددگار رہے' اس کے ساتھ کیسی کیسی یادگاریں وابستہ ہیں۔ کیا میں جیتے جی اسے اپنے پہلو سے جدا کر دوں۔ اگر مجھ پر کوئی فرد بشر اس تیغہ کا استعمال میرے مقابلے میں زیادہ کارگذاری کے ساتھ کر سکتا۔ اگر میرے بازوؤں میں تیغہ پکڑنے کی قوت نہ ہوتی تو بخدا میں خود ہی تیغہ کمر سے کھول کر رکھ دیتا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میں ان الزامات سے بری ہوں پھر کیوں میں اسے ہاتھ سے دوں؟ کیا اس لئے کہ چند بد خواہ حاسدوں نے سردار نمک خوار کو میری جانب سے بدظن کر دیا ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا مگر پھر اسے خیال آیا کہ میری سرکشی پر سردار اور بھی برگشتہ ہوجائیں گے۔ اور یقیناً مجھ سے تلوار بزور شمشیر چھین لی جائے گی۔ ایسی حالت میں

میرے اوپر نثار ہونے والے سپاہی کب اپنے تئیں قابو میں رکھ سکیں گے۔ ضرور آپس میں خون کی ندیاں بہیں گی۔ اور بھائی بھائی کا سر کاٹے گا نہ! خدا نہ کرے کہ میرے سبب سے ایسے روح فرسا سانحے درپیش ہوں۔ یہ سوچ کر اس نے چپکے سے شمشیر سردار نمک خوار کے پہلو میں رکھ دی اور خود سر نیچا کئے ضبط کی انتہائی قوت سے غصہ کو دباتا ہوا خیمہ سے باہر نکل آیا ؂

مسعود پر ساری فوج فخر کرتی تھی اور اس پر جانیں وار کرنے کے لئے سر بکف رہتی تھی۔ جس وقت اس نے شمشیر آبدار کھولی ہے دو ہزار سورما سپاہی نیام پر ہاتھ رکھے اور شعلہ بار آنکھوں سے تکتے کنوتیاں بدل رہے تھے۔

مسعود کے ایک ذرا سے اشارے کی دیر تھی اور دم کے دم میں لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ مگر مسعود شجاعت ہی میں یگانہ روزگار نہ تھا۔ ضبط اور استقلال میں بھی اس کا ثانی نہ تھا۔ اس نے یہ ذلت و رسوائی سب گوارا کی۔ تلوار دینا گوارا کیا مگر بغاوت کا الزام لینا گوارا نہ کیا اور ہم چشموں کے روبرو مر گوارا کیا۔ مگر یہ نہ گوارا کیا کہ اس کی ذات سے فوج میں سرکشی اور نافرمانبرداری کا خیال پیدا ہوا ہو اور ایسے نازک وقت میں جب کہ کتنے ہی دلیران جنگ آزما ضبط ہاتھ سے کھو بیٹھتے اور عالم غیظ و غضب میں ایک دوسرے کے گلے کاٹتے۔ مسعود خاموش اور ثابت قدم رہا۔ اس کی پیشانی پر ذرا بھی بل نہ آیا، اس کے تیور ذرا بھی نہ بدلے۔ اس نے خونبار آنکھوں سے رفیقوں

کو خیر باد کیا اور بادل حسرت اٹھا اور ایک غار کوہ میں چھپ بیٹھا اور جب آفتاب کے غروب ہو جانے پر وہاں سے اٹھا تو اس کے دل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ داغ بدنامی ماتھے سے مٹاؤں گا اور حاسدوں کو ندامت کے غار میں گراؤں گا
مسعود نے لباس فقیرانہ اختیار کیا۔ سر پر خود کے بجائے لمبی جٹائیں بنائیں۔ جسم پر بجائے زرہ و بکتر کے گیروئے رنگ کا بانا سجا ہاتھ میں تلوار کے بجائے قدح فقیری لیا۔ نعرۂ جنگ کے بجائے یاحق کی صدا بلند کی۔ اور اپنا نام شیخ مخمور رکھ دیا۔ مگر یہ جوگی دوسرے جوگیوں کی طرح دھونی رما کر نہ بیٹھا اور نہ فقر و ریاضت کی تلقین شروع کی۔ وہ غنیم کی فوج میں جاتا اور سپاہیوں کی باتیں سنتا۔ کبھی ان کی مورچہ بندیوں کی طرف نگاہ دوڑاتا۔ کبھی ان کے دمدموں اور فیصلوں کا معائنہ کرتا۔ تین بار سردار نمک خوار غنیم کے پنجے سے ایسے وقت نکلے جب کہ انہیں جان براری کی کوئی آس نہ رہی تھی۔ اور یہ سب شیخ مخمور کی کرامات تھی۔ منقاد کا قلعہ جیتنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ پانچ ہزار جنگ آور سپاہی اس کی محافظت میں تیار بیٹھے تھے۔ تیس اژدر دہان توپیں آگ کے گولے اگلنے کے لئے منھ کھولے ہوئے تھیں۔ اور دو ہزار تیر اندازان پُرفن ہاتھوں میں موت کا پیغام لئے حکم کے منتظر تھے۔ مگر جس وقت سردار نمک خوار اپنے دو ہزار جانبازوں کے ساتھ اس قلعے پر چڑھا تو پانچوں ہزار مخالف سپاہی کاٹھ کے پتلے بن گئے۔ توپوں کے منھ بند ہو گئے۔ اور تیراندازوں کے تیر ہوا میں بلند پروازیاں کرنے لگے۔ اور یہ سب

شیخ مخمور کی کرامات تھی۔ شاہ صاحب وہیں موجود تھے۔ سردار دوڑ کر ان کے قدموں پر گر پڑا۔ اور ان کے قدموں کی خاک پیشانی پر لگائی۔

(۴)

کشور کشا ثانی کا دربار آراستہ ہے۔ مے ناب کا دور چل رہا ہے اور امراؤ رؤسا درجہ بدرجہ زانوئے ادب تہ کئے ہوئے بیٹھے ہیں۔ یکایک مخبروں نے خبر دی کہ میر شجاع کو شکست نصیب ہوئی اور جان سے مارے گئے۔ یہ سُن کر کشور کشا کے چہرے پر تفکر کے آثار نمودار ہوئے۔ سرداروں سے مخاطب ہو کر بولے "آپ لوگ میں ایسا دلیر کون ہے جو اس بد اندیش سردار کا سر قلم کر کے ما بدولت کے سامنے پیش کرے۔ اس کی گستاخیاں اب درجۂ اعتدال سے گزرتی جاتی ہیں۔ آپ ہی لوگوں کے بزرگوں نے یہ ملک خاندان مرادیہ سے بزور شمشیر چھینا تھا۔ کیا آپ انہیں بزرگوں کی اولاد نہیں ہیں؟" یہ سنتے ہی سرداروں میں ایک سناٹا چھا گیا۔ سب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور کسی کی ہمت نہ پڑی کہ دعوت شاہ قبول کرے۔ آخر شاہ کشور کشا کے عم بزرگوار اٹھے اور بولے اے شاہ جواں بخت! میں تیری دعوت قبول کرتا ہوں۔ اگرچہ میرے قویٰ ضعیف ہو گئے ہیں اور بازوؤں میں تلوار پکڑنے کی قوت باقی نہیں رہی۔ مگر میرے خون میں وہی گرمی اور دل میں وہی جوش ہے جن کی بدولت ہم نے یہ ملک شاہ بامراد سے لیا تھا۔ یا تو میں اس سگِ ناپاک کی ہستی خاک میں ملادوں گا

یا اس کوشش میں اپنی جان نثار کر دوں گا۔ تاکہ اپنی نظروں سے طوائف الملوکی کے منظر نہ دیکھوں۔ یہ کہہ کر امیر پُر تدبیر وہاں سے اٹھا اور مستعدی سے جنگی تیاریوں میں مصروف ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ آخری مقابلہ ہے اور اگر اس میں ناکام رہے تو بجز مر جانے کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ ادھر سردار نمک خوار آہستہ آہستہ پایہ تخت کی طرف بڑھتا آتا تھا۔ یکایک اسے خبر ملی کہ امیر پُر تدبیر بیس ہزار پیدل اور سواروں کے ساتھ مقابلے کے لئے آرہا ہے ؛

یہ سنتے ہی سردار نمک خوار کی ہمتیں ٹوٹ گئیں۔ امیر پُر تدبیر باوجود پیرانہ سالی کے اپنے وقت کا ہی سپہ سالار تھا۔ اس کا نام سن کر دلیران جنگ آزما کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔ سردار نمک خوار کا خیال تھا کہ اب امیر گوشۂ عبادت میں بیٹھے ہوں گے۔ مگر ان کو اپنے مقابلے میں دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ مبادا اس شکست سے ہم اپنی ساری فتوحات کھو بیٹھیں اور برسوں کی محنت پر پانی پھر جائے۔ سب کی یہی صلاح ہوئی کہ واپس چلنا ہی مصلحت ہے۔ اس وقت شیخ مخمور نے فرمایا ؛

اے سردار نمک خوار! تو نے ملک جنت نشان کی نجات کا بیڑا اٹھایا ہے۔ کیا انہیں ہمتوں سے تیری آرزوئیں بر آئیں گی۔ تیرے سردار اور سپاہیوں نے کبھی میدان سے قدم پیچھے نہیں ہٹایا، کبھی پیٹھ نہیں دکھائی۔ تیروں کی بوچھار کو تم نے پانی کی بوچھار سمجھا اور بندوقوں کی باڑھ کو پھولوں کی بہار۔ کیا ان مدارات سے تم اس قدر جلد سیر ہو گئے

تم نے یہ جنگ توسیع سلطنت کے کمینہ ارادے سے نہیں چھیڑی ہے تم حق اور انصاف کی لڑائی لڑ رہے ہو۔ کیا تمہارا جوش اتنی جلد ٹھنڈا ہو گیا کیا تمہاری تیغ انصاف اتنے جلد بجھ گئی۔ تم خوب جانتے ہو کہ انصاف اور حق کی فتح ضرور ہوگی اور تمہاری اس جانفشانیوں کا صلہ دربار عالی سے ضرور عطا ہوگا۔ پھر ابھی سے کیوں حوصلے چھوڑے دیتے ہو؟ کیا مضائقہ ہے اگر امیر پرتدبیر بڑا دلیر اور الوالعزم سپاہی ہے۔ اگر وہ شیر ہے تو تم شیر مرد ہو۔ اگر اس کی تلوار لوہے کی ہے تو تمہارا تیغہ فولاد کا ہے اگر اس کے سپاہی جانباز ہیں تو تمہارے سپاہی بھی سرفروش ہیں۔ ہاتھوں میں تیغہ مضبوط پکڑو۔ اور نام خدا لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑو۔ تمہارے تیور کہے دیتے ہیں کہ میدان تمہارا ہے ؛

اس پُرجوش تقریر نے سرداروں کے حوصلے ابھار دئے۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ تلواریں پہلو بدلنے لگیں اور قدم بے اختیار عرصۂ کارزار کی طرف بڑھے۔ شیخ مخمور نے تب دلق فقیری اتار پھینکا۔ قدح فقیری کو سلام کیا۔ اور ہاتھوں میں وہی تیغہ اور سپر لے کر جو کسی وقت مسعود سے چھینے گئے تھے، سردار نمک خوار کے پہلو بہ پہلو سپاہیوں اور افسروں کا دل بڑھاتے۔ شیرانہ وار بھرتا ہوا چلا۔ آدھی رات کا وقت تھا امیر کے سپاہی ابھی منزلیں مارے چلے آتے تھے۔ بیچارے دم بھی نہ لینے پائے تھے کہ یکایک سردار نمک خوار کے آپہنچنے کی خبر پائی۔ ہوش اڑ گئے اور ہمتیں ٹوٹ گئیں۔ مگر امیر شیر کی طرح گرج کر خیمے سے باہر

آیا اور دم زدن میں اپنی ساری فوج دشمن کے مقابلے میں صف بستہ کھڑی کر دی۔ گویا ایک باغبان تھا کہ آیا اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے پھولوں کو ایک گلدستہ میں سجا گیا ❊

دونوں فوجیں کالے کالے پہاڑوں کی طرح آمنے سامنے کھڑی تھیں اور توپوں کی آتش باری کوہِ آتش فشاں کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ان کی گھن گرج صدا سے ایک شورِ محشر بپا تھا۔ یہ پہاڑ بتدریج آگے بڑھتے گئے۔ یکایک وہ ٹکرائے اور کچھ اس زور سے ٹکرائے کہ زمین کانپ اٹھی۔ اور گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ مسعود کا تیغ اس وقت بلائے بے درماں تھا۔ جدھر پہنچتا لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے تھے اور سینکڑوں سر اس پر سے نثار ہو جاتے تھے ❊

پو پھٹے تک تیغے یوں کھڑکا کئے اور یوں ہی خون کا دریا بہتا رہا۔ جب روز روشن ہوا تو میدان جنگ بازار مرگ سے مشابہ ہو رہا تھا۔ جدھر نگاہ اٹھتی تھی مقتولین کے سر اور اعضا لہو میں تیرتے دکھائی دیتے تھے۔ یکایک شیخ مخمور کی کمان سے ایک تیر برق بن کر نکلا اور امیر پُرتدبیر کے خرمن جان پر گرا اور اس کے گرتے ہی فوج قیصری نے راہ گریز اختیار کی اور سرداری فوج فتح و نصرت کا علم بلند کئے پایۂ تخت کی طرف بڑھی ❊

(۵)

جب یہ فوج ظفر موج شہر پناہ کے اندر داخل ہوئی تو شہر کے زن

و مرد جو مدت دراز سے غلامی کے جور و ستم جھیل رہے تھے، اس کے خیر مقدم کے لئے نکل پڑے۔ سارا شہر اُمڈ آیا۔ لوگ سپاہیوں کو گلے لگاتے تھے اور ان پر پھولوں کی برکھا کرتے تھے گویا بلبلیں تھیں جو پنجۂ صیاد سے رہائی پانے پر گلستانِ چمن میں گلوں کو چوم رہی تھیں لوگ شیخ مخمور کے قدموں کی خاک پیشانی سے لگاتے تھے اور سردار نمک خوار کے پیروں پر مسرت اور انبساط کے آنسوں بہاتے تھے۔

اب موقع تھا کہ مسعود اپنا جوگیا بھیس اتار پھینکے اور دعوئے تاج و تخت پیش کرے۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ ملکہ شیر افگن کا نام ہر شخص کی زبان پر ہے تو خاموش ہو رہا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر میں اپنا دعویٰ پایۂ ثبوت کو پہنچاؤں تو ملکہ کا دعویٰ باطل ہو جائے گا۔ مگر تاہم یہ ناممکن تھا کہ بلا سخت کشت و خون کے یہ فیصلہ ہو سکے۔ ایک پُرجوش اور آرزومند دل کے لئے اس حد تک ضبط کرنا معمولی بات نہ تھی۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا یہ خیال کہ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں، اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا تھا۔ شاہ بامراد کی وصیت اسے ایک دم کو بھی نہ بھولتی تھی۔ دن کو وہ بادشاہت کے منصوبے باندھتا اور رات کو بادشاہت کے خواب دیکھتا۔ یہ یقین کہ میں بادشاہ ہوں، اسے بادشاہ بنائے ہوئے تھا۔ افسوس! آج وہ منصوبے ٹوٹ گئے اور وہ خواب پریشان ہو گیا۔ مگر مسعود کے اوصاف میں مردانہ ضبط کی انتہائی حد کھینچ گئی تھی۔ اس نے اف تک نہ کی۔ ایک ٹھنڈی آہ بھی نہ بھری۔ بلکہ پہلا

شخص جس نے ملکہ کے دست مبارک کا بوسہ دیا اور اس کے روبرو سرِ اطاعت خم کیا، وہ فقیر مخمور تھا۔ وہاں عین اس وقت جب کہ وہ بوسہ لے رہا تھا اس کی زندگی بھر کی آرزوئیں آنسو کا ایک قطرہ بن کر ملکہ کے کفِ حنائی پر گر پڑیں۔ گویا مسعود نے اپنا دُرِّ آرزو ملکہ کو نپ دیا۔ ملکہ نے ہاتھ کھینچ لیا اور فقیر مخمور کے چہرے پر شفقت آمیز نگاہ ڈالی۔ جب سب اراکین سلطنت نذریں گذران چکے، توپوں کی سلامیاں دغنے لگیں۔ شہر میں عیش و نشاط کا بازار گرم ہو گیا اور مسرت اور شادمانی کے جلوے ہر چہار طرف نظر آنے لگے ‫۔

تخت نشینی کے تیسرے دن مسعود گوشۂ عبادت میں بیٹھا ہوا تھا کہ ملکہ شیر افگن تنہا اس کے پاس آئی اور بولی "مسعود! میں ایک ناچیز تحفہ تمہارے لئے لائی ہوں اور وہ میرا دل ہے۔ کیا تم اسے میرے ہاتھ سے قبول کرو گے؟ مسعود ششدر رہ گیا۔ مگر جب ملکہ کی آنکھیں نشۂ الفت الفت سے مخمور پائیں تو فرطِ شوق سے اٹھا اور اسے سینے سے لگا کر بولا۔ "میں تو مدت سے تمہاری ہی نوکِ سناں کا گھائل ہوں۔ زہے نصیب کہ آج تم مرہم رکھنے آئی ہو۔"

(۶)

ملک جنت نشان اب آزادی کا مسکن اور خوشحالی کا مرز بوم ہے۔ ملکہ شیر افگن کو ابھی تخت پر بیٹھے سال بھر سے زیادہ نہیں گذرا۔ مگر کاروبار سلطنت بڑی خوبی اور حسن انتظام سے چل رہا ہے اور اس کارِ اہم میں

اس کا پیارا شوہر مسعود جو ابھی تک فقیر مخمور ہی کے نام سے مشہور ہے اس مشیر و معاون ہے ؂

رات کا وقت تھا۔ دربار شاہی آراستہ تھا۔ وزرار عالی مقام حسب رتبہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور خدام زرق برق مغرق وردیاں پہنے دستہ بستہ کھڑے تھے کہ ایک پیش خدمت نے آکر عرض کی ملکہ دوجہاں! ایک خستہ حال عورت باہر کھڑی ہے اور شرف قدمبوسی چاہتی ہے۔ اراکین سلطنت چونکے اور ملکہ نے استعجاب آمیز لہجے میں کہا اندر حاضر کرو۔ پیش خدمت باہر چلا گیا۔ اور ذرا دیر میں ایک بڑھیا لاٹھی ٹیکتی ہوئی آئی اور اپنی پٹاری سے ایک مرصع تاج نکال کر بولی "تم لوگ اسے لے لو۔ اب یہ میرے کسی کام کا نہیں رہا۔ میاں نے مرتے وقت اسے مسعود کو دے کر کہا تھا کہ تم اس کے مالک ہو۔ مگر اپنے جگر کے ٹکڑے مسعود کو کہاں ڈھونڈوں۔ روتے روتے اندھی ہو گئی۔ ساری دنیا کی خاک چھانی۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہ لگا۔ اب زندگی سے عاجز آ گئی ہوں۔ جی کر کیا کروں گی۔ یہ امانت میرے پاس ہے جس کا جی چاہے لے لے۔"

دربار میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ فرطِ حیرت سے نقش دیوار بنے ہوئے تھے۔ گویا ایک ساحر تھا کہ انگلی کے اشارے سے سب کا دم بند کئے ہوئے تھا۔ یکایک مسعود اپنی جگہ سے اٹھا اور روتا ہوا جا کر رندہ کے قدموں پر گر پڑا۔ رندہ اپنے لختِ جگر کو دیکھتے ہی پہچان گئی۔ اسے چھاتی سے لگا لیا اور وہ تاج مرصع اس کے زیب سر کر کے بولی ؂

"صاحبو! یہی میرا پیارا مسعود اور شاہ بامراد کا لختِ جگر ہے۔ تم لوگ اس کی رعایا ہو۔ یہ تاج اس کا ہے۔ یہ ملک اس کا ہے اور ساری خلقت اس کی ہے۔ آج سے وہ اپنے ملک کا بادشاہ ہے اور اپنی قوم کا خادم۔"

دربار میں ایک شورِ قیامت برپا ہوگیا۔ اراکین اٹھے اور مسعود کو ہاتھوں ہاتھ لے جاکر تخت پر ملکہ شیر افگن کے پہلو میں بٹھا دیا۔ نذریں گزرنے لگیں۔ نفیروں نے شادمانی کا نغمہ گایا اور باجوں نے کامرانی کا شور مچایا۔ مگر جب یہ جوشِ مسرت ذرا کم ہوا اور لوگوں نے رندہ کو دیکھا تو وہ مر گئی تھی۔ آرزوؤں کے پورے ہوتے ہی جان نکل گئی۔ گویا آرزوئیں روح بن کر اس کے تنِ خاکی کو زندہ کئے ہوئی تھیں ؞

یہی میرا وطن ہے

آج پورے ساٹھ برس کے بعد مجھے اپنے وطن۔ پیارے وطن کا دیدار پھر نصیب ہوا۔جس وقت میں اپنے پیارے دیس سے رخصت ہوا اور قسمت مجھے مغرب کی طرف لے چلی۔ مجھ پر شباب کا عالم تھا۔میری رگوں میں تازہ خون دوڑتا تھا اور سینہ امنگوں اور بڑے بڑے ارادوں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے پیارے ہندوستان سے کسی ظالم کے جور و جبر یا انصاف کے زبردست ہاتھوں نے نہیں جدا کیا تھا۔نہیں۔ ظالم کا ظلم۔اور قانون کی سختیاں مجھ سے جو چاہیں کرا سکتی ہیں۔ مگر میرا وطن مجھ سے نہیں چھڑا سکتیں۔ یہ میرے بلند ارادے اور بڑے بڑے منصوبے تھے جنہوں نے مجھے دیس سے جلا وطن کیا۔ میں امریکہ میں خوب تجارت کی۔ خوب دولت کمائی اور خوب عیش کئے۔ خوبی قسمت سے بیوی بھی ایسی پائی جو حسن میں اپنی آپ ہی نظیر تھی۔ جس کی خوبروئی کا شہرہ سارے امریکہ میں پھیلا ہوا تھا۔اور جس کے سینے میں کسی ایسے خیال کی گنجائش بھی نہ تھی، جس کا مجھ سے تعلق نہ ہو۔ میں اس دل و جان سے فدا تھا۔ اور وہ میرے لئے سب کچھ تھی۔ میرے پانچ بیٹے ہوئے۔ خوشرو۔ قوی ہیکل اور سعادت مند جنہوں نے تجارت کو اور بھی چمکایا۔اور جن کے بھولے ننھے بچے اس وقت میری گود میں

بیٹھے ہوئے تھے جب میں نے پیارے وطن کا آخری دیدار دیکھنے کے لئے قدم اٹھایا۔ میں نے بیشمار دولت وفادار بیوی سپوت بیٹے اور پیارے پیارے جگر کے ٹکڑے۔ ایسی ایسی بے بہا نعمتیں ترک کردیں۔ اس لئے کہ پیاری بھارت ماتا کا آخری دیدار کرلوں۔ میں بہت ضعیف ہوگیا ہوں۔ دس اور ہوں تو پورے سو برس کا ہو جاؤں۔ اور اگر اب میرے دل میں کوئی آرزو باقی ہے تو وہ یہی ہے کہ اپنے وطن کی خاک کا پیوند بنوں۔ یہ آرزو کچھ آج ہی میرے دل میں موجزن نہیں ہوئی ہے۔ نہیں اس وقت بھی جب کہ میری بیوی اپنی شیریں کلامیوں اور نازک ادائیوں سے میرا دل خوش کیا کرتی تھی جب کہ میرے نوجوان بیٹے سویرے آکر اپنے بوڑھے باپ کو ادب سے سلام کرتے تھے۔ اس وقت بھی میرے جگر میں ایک کانٹا سا کھٹکتا تھا۔ اوہ کانٹا یہ تھا کہ میں یہاں جلاوطن ہوں۔ یہ دیس میرا نہیں ہے۔ میں اس دیس کا نہیں ہوں۔ دہن میرا تھا۔ بیوی میری تھی۔ لڑکے میرے تھے اور جائدادیں میری تھیں۔ مگر جانے کیوں مجھے رہ رہ کر وطن کے شکستہ جھونپڑے۔ اور ترکہ کی چند بیگھہ زمین اور بچپن کے ساتھیوں کی یاد ستایا کرتی تھی اور اکثر مسرتوں کی گھما گھمی اور شادمانیوں کے ہجوم میں بھی یہ خیال دل میں چٹکی لیا کرتا کہ کاش اپنے دیس میں ہوتا!

مگر جس وقت بمبئی میں جہاز سے اترا اور کالے کالے کوٹ پتلون پہنے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتے ملاح دیکھے۔ پھر انگریزی دکانیں۔ ٹرام وے اور موٹر کاڑیاں نظر آئیں پھر ربڑ والے پہیوں اور چرٹ والے آدمیوں سے مٹ بھیڑ ہوئی۔ پھر ریل کا اسٹیشن دیکھا اور ریل پر سوار ہو کر اپنے گاؤں کو چلا۔ پیارے گاؤں کو جو ہری

بھری پہاڑیوں کے بیچ میں واقع تھا۔ تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں خوب رویا۔ کیونکہ یہ میرا پیارا دیس نہ تھا۔ یہ وہ دیس نہ تھا جس کے دیدار کی آرزو ہمیشہ میرے دل میں موجیں مارا کرتی تھی۔ یہ کوئی اور دیس تھا۔ یہ امریکہ تھا۔ انگلستان تھا۔ مگر پیارا بھارت نہیں!

ریل گاڑی جنگلوں۔ پہاڑوں ندیوں اور میدانوں کو طے کر کے میرے پیارے گاؤں کے قریب پہنچی جو کسی زمانے میں پھول پتوں کی افراط اور ندی نالوں کی کثرت سے رشکِ فردوس بنا ہوا تھا۔ میں گاڑی سے اترا تو میرا دل بانسوں اچھل رہا تھا۔ اب اپنا پیارا گھر دیکھوں گا۔ اپنے بچپن کے پیارے ساتھیوں سے ملوں گا۔ مجھے اس وقت بہ بالکل یاد نہ رہا کہ میں اسیؔ برس کا بوڑھا آدمی ہوں۔ جوں جوں میں گاؤں کے قریب آتا تھا میرے قدم جلد جلد اٹھتے تھے۔ اور دل پر ایک ناقابلِ بیان مسرت کا اثر ہو رہا تھا۔ ہر چیز پر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نگاہ ڈالتا۔ اہا! یہ وہ نالا ہے جس میں ہم روز گھوڑے نہلاتے اور خود غوطے لگاتے تھے۔ مگر اب اس کے دونوں طرف کانٹے دار تاروں کی چہار دیواری کھنچی ہوئی تھی اور سامنے ایک بنگلہ تھا جس میں دو تین انگریز بندوقیں لئے ادھر ادھر تاک رہے تھے۔ نالے میں نہانے یا نہلانے کی قطعی ممانعت تھی۔ گاؤں میں گیا۔ اور نگاہیں بچپن کے ساتھیوں کو ڈھونڈنے لگیں۔ مگر افسوس! وہ سب کے سب لقمۂ اجل ہو گئے تھے۔ اور میرا گھر۔ میرا شکستہ جھونپڑا۔ جس کی گود میں برسوں تک کھیلا تھا۔ جہاں بچپن اور بے فکریوں کے مزے لوٹے تھے۔ جس کا نقشہ ابھی تک آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ وہ اب ایک تودۂ خاکستر ہو گیا تھا۔ مقام غیر آباد نہ تھا۔ صدہا آدمی چلتے

پھرتے نظر آئے۔ جو عدالت اور کلکٹری اور تھانہ پولیس کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کے چہروں سے تفکر اور پژمردگی نمایاں تھی۔ اور وہ سب افکار دنیا سے خستہ حال معلوم ہوتے تھے۔ میرے ساتھیوں کے سے قوی ہیکل۔ خوش رو۔ سرخ و سفید نوجوان کہیں نہ دکھائی دیئے۔ وہ اکھاڑا جس کی میرے ہاتھوں نے بنیاد ڈالی تھی۔ وہاں اب در و دیوار شکستہ اسکول تھا۔ اور اس میں چند مریض صورت گرسنہ رو اور دلق پوش لڑکے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ نہ! یہ میرا دیس نہیں ہے یہ دیس دیکھنے کے لیے میں اتنی دور سے نہیں آیا۔ یہ کوئی اور دیس ہے۔ میرا پیارا دیس نہیں!

اس برگد کے پیڑ کی طرف دوڑا جس کے خوشگوار سائے میں ہم نے بچپن کی بہاریں اڑائی تھیں۔ جو ہمارے چھٹپنے کا گہوارہ اور عالم جوانی کا آرام گاہ تھا۔ آہ! اس پیارے برگد کو دیکھتے ہی دل پر ایک رقت طاری ہوگئی اور ایسی ایسی حسرت ناک۔ دل سوز اور درد ناک یادگاریں تازہ ہوگئیں کہ گھنٹوں زمین پر بیٹھ کر روتا رہا۔ یہی پیارا برگد ہے جس کی پھنگیوں پر ہم چڑھ جاتے تھے۔ جس کی جٹائیں ہمارا جھولا تھیں۔ اور جس کے پھل ہمیں ساری دنیا کی مٹھائیوں زیادہ لذیز اور شیریں معلوم ہوتے تھے۔ وہ میرے گلے میں باہیں ڈال کر کھیلنے والے ہمجولی۔ جو کبھی روٹھتے تھے۔ کبھی مناتے تھے۔ وہ کہاں گئے۔ آہ میں غربت زدہ مسافر کیا اب اکیلا ہوں؟ کیا میرا کوئی ساتھی نہیں۔ اس برگد کے درخت کے قریب اب تھانہ تھا اور درخت کے نیچے ایک کرسی پر کوئی لال پگڑی باندھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے آس پاس دس بیس اور لال پگڑی

والے دست بستہ کھڑے تھے اور ایک نیم برہنہ قحط زدہ شخص جس پر ابھی ابھی چابکوں کی بوچھار ہوئی تھی، پڑا سسک رہا تھا۔ مجھے خیال آیا یہ میرا پیارا دیس نہیں ہے۔ یہ کوئی اور دیس ہے۔ یہ یورپ ہے۔ یہ امریکہ ہے مگر میرا پیارا وطن نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ؂

ادھر سے مایوس ہو کر میں اس چوپال کی طرف چلا۔ جہاں شام کے وقت پتاجی گاؤں کے اور بزرگوں کے ساتھ حقہ پیتے اور ہنسی قہقہے اڑاتے تھے۔ ہم بھی اس ٹاٹ کے فرش پر کلا بازیاں کھایا کرتے۔ کبھی کبھی وہاں پنچایت بھی بیٹھتی تھی۔ جس کے سرپنچ ہمیشہ پتاجی ہوتے تھے۔ اسی چوپال سے ملحق ایک گئو شالہ تھا۔ جہاں گاؤں بھر کی گائیں رکھی جاتی تھیں۔ اور ہم یہیں بچھڑوں کے ساتھ کلیلیں کیا کرتے تھے۔ افسوس! اب اس چوپال کا پتہ نہ تھا۔ وہاں اب گاؤں کے ٹیکہ لگانے کا اسٹیشن اور ایک ڈاکخانہ تھا۔ ان دنوں اسی چوپال سے لگا ہوا ایک کولہواڑہ تھا جہاں جاڑے کے دنوں میں اوکھ پیری جاتی تھا اور گڑ کی خوشبو سے دماغ معطر ہو جاتا تھا۔ ہم اور ہمارے ہمجولی گھنٹوں گنڈیریوں کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے۔ اور گنڈیریاں کاٹنے والے مزدور کی سبکدستی پر حیرت کرتے تھے۔ جہاں صدہا بار میں نے کچا رس اور پکا دودھ ملا کر پیا تھا۔ یہاں آس پاس کے گھروں سے عورتیں اور بچے اپنے اپنے گھڑے لے کر آتے۔ اور انہیں رس سے بھرا کر لے جاتے۔ افسوس! وہ کولہو ابھی جیوں کے تیوں گڑے ہوئے ہیں۔ مگر دیکھو! کولہواڑے کی جگہ پر اب ایک سن لپیٹنے والی کل ہے اور اس کے مقابل ایک تمبولی اور ایک سگرٹ کی دوکان ہے۔ ان جگر خراش نظاروں سے میں دل

شکستہ ہو کر ایک آدمی نے جو صورت سے شریف نظر آتا تھا۔ کہا بابا میں پردیسی مسافر ہوں۔ رات بھر پڑ رہنے کے لئے مجھے جگہ دے دو۔ اس آدمی نے مجھے سر سے پیر تک غور کی نگاہ سے دیکھا اور تب بولا آگے جاؤ۔ یہاں جگہ نہیں ہے۔ میں آگے گیا اور یہاں سے پھر حکم ملا کر آگے جاؤ۔ پانچویں بار دست سوال پھیلانے پر ایک صاحب نے مٹھی بھر چنے میرے ہاتھ پر رکھ دئے۔ چنے میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑے اور پھر آنکھوں سے اشک کی دھار بہنے لگی۔ ہائے! یہ میرا پیارا دیس نہیں ہے۔ یہ کوئی اور دیس ہے۔ یہ ہمارا مہمان نواز۔ مسافر نواز۔ پیارا وطن نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ؟

میں نے ایک سگرٹ کی ڈبیا لی ایک سنسان جگہ پر بیٹھ کر اگلے وقتوں کو یاد کرنے لگا کہ یکایک مجھے اس دھرم شالہ کا خیال آیا جو میرے پردیس جاتے وقت بن رہا تھا۔ میں ادھر کی طرف لپکا کہ رات کسی طرح وہیں کاٹ لوں۔ مگر افسوس! ہائے افسوس! دھرم شالہ کی عمارت جوں کی توں تھی۔ لیکن اس میں غریب مسافروں کے رہنے کے لئے جگہ نہ تھی۔ شراب اور شراب خوری، بدکاری اور قمار بازی نے اسے اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر بے اختیار دل سے ایک ٹھنڈی آہ نکلی۔ میں زور سے چیخ اٹھا۔ "نہیں۔ نہیں اور ہزار بار نہیں۔ یہ میرا وطن۔ یہ میرا پیارا دیس۔ میرا پیارا بھارت نہیں ہے۔ یہ کوئی اور دیس ہے یہ یورپ ہے۔ امریکہ ہے مگر بھارت نہیں ہے ؟

اندھیری رات تھی۔ گیدڑ اور کتے اپنا راگ الاپ رہے تھے۔ مگر بادل پُردرد اسی نالے کے کنارے جا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ کیا پھر اپنے پیارے بچوں کے پاس لوٹ جاؤں۔ اور اپنی نامراد مٹی امریکہ کے خاک میں ملادوں

اب تک میرا کوئی وطن تھا۔ میں غریب الوطن ضرور تھا۔ مگر میرے پیارے وطن کی یاد دل میں بنی ہوئی تھی۔ اب میں بے وطن ہوں۔ میرا کوئی وطن نہیں۔" اسی غور و خوض میں میں بہت دیر تک خاموش سر بہ زانو بیٹھا رہا۔ رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ گھڑیال نے تین بجایا اور کسی کے گانے کی آواز کان میں آئی۔ دل نے گدگدایا۔ یہ تو وطن کا نغمہ ہے۔ یہ دیس کا راگ ہے میں چپٹا اٹھ کھڑا ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پندرہ بیس عورتیں بوڑھی ضعیف۔ سفید دھوتیاں پہنے ہاتھوں میں لوٹے لئے اشنان کو جا رہی ہیں اور گاتی جاتی ہیں ؛

"پربھو میرے اوگن چت نہ دھرو"

اس پُر سرور۔ دل خراش راگ سے میرے دل پہ جو کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ میں نے امریکہ کی شوخ سے شوخ اور خوش مزاج سے خوش مزاج حسینوں کی الاپ سنی تھی۔ اور بارہا ان کی زبانوں سے محبت اور پیار کے الفاظ سنے تھے جو دلکش نغموں سے بھی زیادہ شیریں تھے۔ میں نے پیارے بچوں کے ادھورے بولوں اور تتلاتی ہوئی زبانوں کا لطف اٹھایا تھا۔ میں نے خوشنوا چڑیوں کا چہچہانا سنا تھا۔ مگر جو لطف جو مزہ۔ جو آنند۔ مجھے اس نغمے میں آیا وہ مجھے زندگی میں کبھی اور نہ حاصل نہ ہوا تھا۔ میں نے خود گنگنا کر گایا۔

"پربھو میرے اوگن۔ پربھو میرے اوگن چت نہ دھرو"

میں وجد کے عالم میں تھا کہ پھر مجھے بہت سے آدمیوں کی بول چال سنائی پڑی۔ اور کچھ لوگ ہاتھوں میں پیتل کے کمنڈل لئے۔ شیو۔ شیو۔ ہر۔ ہر۔ گنگے گنگے

نارائن نارائن کہتے ہوئے دکھائی دیے۔ میرے دل نے پھر گدگدایا۔ یہ تو دیس پیارے دیس کی باتیں ہیں۔ فرطِ مسرت سے دل باغ باغ ہوگیا۔ میں ان آدمیوں کے ساتھ ساتھ ہولیا۔ اور ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ میل پہاڑی راستہ طے کرنے کے بعد ہم اس ندی کے کنارے پہنچے۔ جس کا نام مقدس ہے۔ جس کی لہروں میں غوطہ لگانا۔ اور جس کی گود میں مرنا۔ ہر ہندو برکت عظمیٰ سمجھتا ہے۔ گنگا میرے پیارے گاؤں سے چھ سات میل پر بہتی تھی اور کسی زمانے میں میں صبح کے وقت گھوڑے پر چڑھ کر گنگا ماتا کے درشن کو آیا کرتا تھا۔ ان کے درشن کی تمنا میرے دل میں ہمیشہ تھی۔ یہاں میں ہزاروں آدمیوں کو اس سرد ٹھٹھرتے ہوئے پانی میں غوطہ لگاتے ہوئے دیکھا۔ کچھ لوگ بالو پر بیٹھے گائتری منتر جپ رہے تھے۔ کچھ لوگ ہون کرنے میں مصروف تھے۔ کچھ لوگ ماتھے پر ٹیکے لگا رہے تھے۔ کچھ اور لوگ وید منتری بڑی خوش الحانی سے پڑھ رہے تھے۔ میرے دل نے پھر گدگدایا۔ اور میں زور سے کہہ اٹھا۔ ہاں۔ ہاں یہی میرا دیس ہے۔ یہی میرا پیارا وطن ہے۔ یہی میرا بھارت ہے۔ اور اسی کے دیدار کی۔ اسی کے خاک میں پیوند ہونے کی حسرت میرے دل میرے دل میں تھی ؛

میں انتہائی سرور کے عالم میں تھا۔ میں نے اپنا پرانا کوٹ او پتلون اتار پھینکا۔ اور جا کر گنگا ماتا کے گود میں گر پڑا۔ جیسے کوئی بے سمجھ بھولا بھالا بچہ دن بھر ناہمدرد لوگوں کے ساتھ رہنے کے بعد شام کو اپنی پیاری ماں کے گود میں دوڑ کر چلا آئے اور اس کی چھاتی سے چمٹ جائے۔ ہاں اب اپنے دیس میں

ہوں۔ یہ میرا پیارا وطن ہے۔ یہ لوگ میرے بھائی ہیں۔ گنگا میری ماتا ہیں!!!

میں نے عین گنگا کے کنارے ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنوالی ہے اور اب مجھے سوائے رام نام جپنے کے اور کوئی کام نہیں۔ میں روز شام سویرے گنگا اشنان کرتا ہوں۔ اور یہ میری خواہش اور آرزو ہے کہ اس جگہ میرا دم نکلے اور میری ہڈیاں گنگا ماتا کے پاس لہروں کے نظر ہوں۔

میرے لڑکے اور میری بیوی مجھے بار بار بلاتے ہیں۔ مگر اب میں یہ گنگا کا کنارہ اور یہ پیارا دیس چھوڑ کر وہاں نہیں جا سکتا۔ میں اپنی مٹی گنگاجی کو سونپوں گا۔ اب دنیا کی کوئی خواہش۔ کوئی آرزو مجھے یہاں سے نہیں ہٹا سکتی کیونکہ یہ میرا پیارا دیس۔ میرا پیارا وطن ہے اور میری لالسا ہے کہ میں وطن میں مروں ؎

صلۂ ماتم

آج تین سال گذر گئے۔ شام کا وقت تھا۔ میں یونیورسٹی ہال سے خوش خوش چلا آرہا تھا۔ میرے صدہا دوست مجھے مبارکباد دے رہے تھے فرطِ مسرت سے میری باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ میری زندگی کی سب سے پیاری آرزو۔ کہ میں ایم۔اے۔ پاس ہو جاؤں۔ پوری ہو گئی تھی۔ اور ایسی خوبی سے جس کی مجھ کو مطلق امید نہ تھی۔ میرا نمبر اوّل تھا۔ وایس چینسلر صاحب نے خود مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ اور مسکرا کر فرمایا تھا کہ خدا تمہیں اعلیٰ کاموں کی توفیق دے۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میں نوجوان تھا۔ شکیل تھا تندرست تھا۔ مال و زر کی نہ مجھے خواہش تھی اور نہ کچھ کمی تھی۔ والدین بہت کچھ چھوڑ گئے تھے۔ دنیا میں سچی خوشی میسر ہونے کے لئے جن اسباب کی ضرورت تھی وہ سب مجھے حاصل تھے۔ اور سب سے بڑھ کر پہلو میں ایک حوصلہ مند دل تھا جو نام و نمود حاصل کرنے کے لئے بیقرار ہو رہا تھا؛

گھر پر آیا۔ احباب نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ دعوت کی ٹھہری۔ دوستوں کی خاطر و مدارات میں بارہ بج گئے۔ لیٹا تو بے اختیار خیال مس لیلاوتی کی طرف جا پہونچا۔ جو میرے پڑوس میں رہتی تھی۔ اور جس نے میرے

ساتھ بی۔ اے۔ کا ڈپلوما حاصل کیا تھا۔ خوش قسمت ہوگا وہ شخص جو مس لیلا کو بیاہے گا۔ کیسی حسین ہے! کیسی خوش گلو! کیسی خوش مزاج۔ میں کبھی کبھی اس کے یہاں پروفیسر صاحب سے فلسفہ میں مدد لینے کے لئے جایا کرتا تھا۔ وہ دن مبارک ہوتا تھا۔ جب پروفیسر صاحب گھر پر نہ ملتے تھے۔ مس لیلا میرے ساتھ بڑے تپاک سے پیش آتی اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں حضرت مسیح کی پناہ میں آجاؤں تو اسے مجھے اپنی شوہری میں قبول کرنے سے انکار نہ ہوگا۔ وہ شیلی بائرن اور کیٹ کی عاشق تھی۔ اور میرا مذاق بھی بالکل اس کے ہم رنگ تھا۔ ہم جب تنہا ہوتے تو اکثر محبت پر بحث کرنے لگتے۔ اور اس کے منہ سے جذبہ آمیز باتیں سُن سُن کر میرے دل میں گدگدی پیدا ہونے لگتی تھی۔ مگر افسوس! میں اپنا مالک نہ تھا۔ میری شادی ایک معزز گھرانے میں کر دی گئی تھی۔ اور اگرچہ میں ابھی تک اپنی بیوی کی صورت سے بھی آشنا نہ تھا۔ مگر مجھے بجائے شک کے یقینِ کامل تھا کہ مجھے اس کی صحبت میں وہ لطف نہیں آسکتا جو مس لیلا کی صحبت میں ممکن ہے شادی ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ مگر اس نے میرے پاس ایک خط بھی نہ لکھا تھا۔ میں نے دو تین خط لکھے بھی۔ مگر کسی کا جواب نہ ملا۔ اس سے مجھے یہ شک ہو گیا کہ اس کی تعلیم بھی واجبی ہی واجبی ہے۔

آہ! کیا میں اسی لڑکی کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گا؟ اس سوال کے میرے ان تمام ہوائی قلعوں کو ڈھا دیا۔ جو میں نے ابھی ابھی بنائے تھے۔ کیا میں مس لیلا سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھولوں؟ ناممکن

ہے۔ میں کمدنی کو چھوڑ دوں گا۔ میں اپنے یگانوں سے ناتا توڑ لوں گا۔ میں رسوا ہوں گا۔ خوار ہوں گا۔ مگر مس لیلا کو ضرور اپنا شریک حال بناؤں گا ٭

انہیں خیالات سے موثر ہو کر میں نے اپنی ڈائری لکھی اور اسے میز پر کھلا چھوڑ کر بستر پر لیٹ رہا۔ اور سوچتے سوچتے سو گیا ٭

سویرے اُٹھ کر دیکھتا ہوں تو بابو نرنجن داس میرے سامنے کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ڈائری تھی جسے وہ بغور پڑھ رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی میں فرط شوق سے لپٹ گیا۔ افسوس! اب اُس فرشتہ صفت نوجوان کی صورت دیکھنی نہ نصیب ہو گی۔ بے ہنگام موت نے اسے ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔ وہ کمدنی کے حقیقی بھائی تھے۔ نہایت وجیہ و شکیل اور ہنس مکھ۔ سن مجھ سے دو ہی چار سال زیادہ تھا۔ اچھے عہدہ پر ممتاز تھے۔ کچھ دنوں سے اسی شہر میں تبدیل ہو کر آ گئے تھے میری اور ان کی گاڑھی دوستی ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا "کیا تم نے میری ڈائری پڑھ لی؟"

نرنجن۔ "ہاں"

میں۔ "مگر کمدنی سے کچھ نہ کہنا۔"

نرنجن۔ "بہت اچھا نہ کہوں گا۔"

میں۔ "اس وقت کسی سوچ میں ہو۔ میرا ڈپلوما دیکھا۔"

نرنجن۔ "گھر سے خط آیا ہے۔ والد بیمار ہیں۔ دو تین دن میں جانے والا ہوں۔"

میں۔ "شوق سے جائیے۔ ایشور انہیں جلد صحت بخشے۔"

نرنجن۔ "تم بھی چلوگے؟ نہ معلوم کیسا پڑے۔ کیسا نہ پڑے۔"
میں۔ "مجھے تو اس وقت معاف ہی رکھو۔"

نرنجن داس یہ کہہ کر چلے گئے۔ میں نے حجامت درست کی کپڑے بدلے اور مس لیلاوتی سے ملنے کے اشتیاق میں چلا۔ وہاں جاکر دیکھا تو قفل پڑا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ مس صاحبہ کی طبیعت دو تین دن سے خراب تھی۔ تبدیل آب و ہوا کے لئے نینی تال چلی گئی ہیں۔ افسوس! میں ہاتھ مل کر رہ گیا۔ کیا لیلا مجھ سے ناراض تھی؟ اس نے مجھے کیوں اطلاع نہیں دی۔ لیلا! کیا کیا تو بے وفا ہے۔ تجھ سے بیوفائی کی امید نہ تھی۔ فوراً مصمم ارادہ کر لیا کہ آج ڈاک سے نینی تال چل دوں۔ مگر گھر آیا تو لیلا کا خط ملا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا۔ لکھا تھا میں بیمار ہوں میرے جینے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ پلیگ ہے۔ جب تک تم آؤگے غالباً میرا قصہ تمام ہو جائے گا۔ آخری وقت تم سے نہ ملنے کا سخت صدمہ ہے۔ میری یاد دل میں قائم رکھنا۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ تم سے مل کر نہیں آئی۔ میرا قصور معاف کرنا اور اپنی بدقسمت لیلا کو بھلا مت دینا۔ خط میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ دنیا آنکھوں میں تاریک ہوگئی منہ سے ایک سرد آہ نکلی۔ بلا ایک لمحہ ضائع کئے ہوئے میں نے بستر باندھا اور نینی تال چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ گھر سے نکلا ہی تھا کہ پروفیسر بوس سے ملاقات ہوگئی۔ کالج سے چلے آرہے تھے چہرہ مغموم تھا۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے جیب سے ایک تار نکال کر میرے سامنے پھینک دیا۔ میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ تار کون اٹھاتا ہے۔ اور بلئے کر کے بیٹھ گیا۔ لیلا تو اتنی جلد مجھ سے جدا ہو گئی!

(۲)

میں روتا ہوا گھر آیا۔ اور چارپائی پر منہ ڈھانپ کر خوب رویا۔ نینی تال جانے کا ارادہ فسخ ہوگیا۔ دس بارہ دن تک میں وحشت کے عالم میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ دوستوں کی صلاح ہوئی کہ چند روز کے لئے کہیں گھومنے چلے جاؤ۔ میرے دل میں بھی یہ بات جم گئی۔ نکل کھڑا ہوا۔ اور دو مہینے تک وندھیاچل۔ پارسناتھ وغیرہ پہاڑیوں میں سرگرداں پھرتا رہا۔ بارے نئے نئے مقامات اور مناظر کی سیر سے طبیعت کو ذرا تسکین ہوئی۔ میں آبو میں تھا جب میرے نام تار پہونچا کہ میں کالج کی اسسٹنٹ پروفیسری پر نامزد کیا گیا ہوں۔ جی تو نہ چاہتا تھا کہ پھر اس شہر میں آؤں۔ مگر پرنسپل کے خط نے مجبور کر دیا۔ ناچار لوٹا اور اپنے فرائض انجام دینے لگا۔ زندہ دلی نام کو نہ باقی رہی تھی دوستوں کی صحبت سے بھاگتا اور ہنسی مذاق سے طبیعت نفور ہوتی۔

ایک روز شام کے وقت میں اپنے اندھیرے کمرے میں لیٹا ہوا عالمِ خیال کی سیر کر رہا تھا کہ سامنے والے مکان سے گانے کی آواز آئی۔ آہ! کیا آواز تھی۔ تیر کی طرح دل میں چبھی جاتی تھی۔ لہجہ کیسا رقت آمیز تھا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ نغموں میں کیا اثر ہے۔ تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کلیجہ مسوسنے لگا۔ اور دل پر ایک عجیب حسرت ناک کیفیت طاری ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہائے! یہ لیلا کی پیاری گیت تھی۔

پیا ملن ہے کٹھن باوری

مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں ایک وحشت کے عالم میں اٹھا اور جا کر سامنے والے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجھے اس وقت یہ تمیز نہ تھی کہ ایک اجنبی آدمی کے مکان پر آ کھڑے ہو جانا اور اس کے خلوت میں مخل ہونا انتہا درجے کی بد تہذیبی ہے ؛

(۳)

ایک بڑھیا نے دروازہ کھول دیا اور مجھے کھڑے دیکھ کر لپکی ہوئی اندر گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ دہلیز طے کرتے ہی ایک وسیع کمرے میں پہونچا اس پر ایک سفید فرش بچھا ہوا تھا۔ گاؤ تکئے بھی رکھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر خوبصورت تصاویر آویزاں تھیں اور ایک سولہ سترہ سال کا سبزہ آغاز نوجوان مسند کے قریب بیٹھا ہوا ہارمونیم پر گا رہا تھا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں کہ ایسا وجیہ نوجوان میری نظروں سے کبھی نہیں گزرا۔ وضع و قطع سے سکھ معلوم ہوتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی چونک پڑا۔ اور ہارمونیم چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ شرم سے سر جھکا لیا اور کچھ گھبرایا ہوا سا نظر آنے لگا۔ میں نے کہا معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی۔ آپ اس فن کے استاد معلوم ہوتے ہیں۔ خصوصاً جو چیز ابھی آپ گا رہے تھے وہ مجھے پسند ہے نوجوان نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر سر نیچا کر لیا اور ہونٹوں میں کچھ اپنی بد مشقی کا اظہار کیا۔ میں نے پھر پوچھا آپ یہاں کب سے مقیم ہیں؟

نوجوان: "تین مہینے کے قریب ہوتا ہے۔"

میں: "اسم شریف؟"

نوجوان: "مجھے مہر سنگھ کہتے ہیں۔"

میں بیٹھ گیا اور گستاخانہ بے تکلفی سے مہر سنگھ کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا اور پھر معذرت مانگی۔ اس وقت کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ پنجاب کا باشندہ ہے اور یہاں پڑھنے کے لئے آیا ہوا ہے۔ شاید ڈاکٹروں نے صلاح دی تھی کہ پنجاب کی آب و ہوا اس کے موافق نہیں ہے۔ میں دل میں تو جھیپا کہ ایک اسکول کے لڑکے کے ساتھ بیٹھ کر ایسی بے تکلفی سے باتیں کر رہا ہوں۔ مگر نغمے کے اشتیاق نے اس خیال کو رہنے نہ دیا۔ رسمی تعارف کے بعد میں نے پھر التجا کی کہ وہی چیز چھیڑ دیئے۔ مہر سنگھ نے آنکھیں نیچی کر کے جواب دیا کہ میں ابھی بالکل نومشق ہوں ؛

میں: "یہ تو آپ ہی اپنی زبان کہیے۔"

مہر سنگھ۔ (جھیپ کر) "آپ کچھ فرمائیں۔ ہارمونیم حاضر ہے۔"

میں: "میں اس فن سے مطلق بے بہرہ ہوں۔ ورنہ آپ کی فرمائش کی ضرور تعمیل کرتا۔"

اس کے بعد میں نے ہر چند اصرار کیا۔ مگر مہر سنگھ جھیپتا ہی رہا۔ مجھے خلقتہً تکلف سے نفرت ہے۔ حالانکہ اس وقت مجھے ترش ہونے کا کوئی حق نہ تھا مگر جب میں نے دیکھا کہ یہ کسی طرح نہ مانے گا تو ذرا رکھائی سے بولا "خیر جانے دیجئے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔ معاف کیجئے۔" یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میری رونی صورت دیکھ کر شاید مہر سنگھ کو

اس وقت رحم آگیا۔ اس نے جھپٹتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا: "آپ تو ناراض ہوئے جاتے ہیں۔"

میں۔ "مجھے آپ سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں۔"

مہر سنگھ۔ "اچھا بیٹھ جائیے میں آپ کی فرمائش کی تعمیل کروں گا مگر میں ابھی بالکل نو مشق ہوں۔"

میں بیٹھ گیا اور مہر سنگھ نے ہارمونیم پر وہی گیت الاپنا شروع کیا۔

"پیا ملن ہے کٹھن باوری"

کیسی سریلی تان تھی! کیسی دلکش آواز۔ کیسا بے چین کرنے والا جذبہ۔ اس کے گلے میں وہ رس تھا جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ میں نے دیکھا کہ گاتے گاتے خود اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مجھ پر اس وقت ایک دلپسند خواب کی سی کیفیت طاری تھی۔ ایک نہایت شیریں۔ نازک۔ دردناک مگر ناقابل بیان اثر دل پر ہو رہا تھا۔ ایک پرُفضا سبزہ زار کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا اور لیلا۔ پیاری لیلا سبزہ زار پر بیٹھی ہوئی میری طرف حسرتناک نگاہوں سے تاک رہی تھی۔ میں نے ایک لمبی آہ بھری۔ اور بلا کچھ کہے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت مہر سنگھ نے میری طرف تاکا۔ اس کی آنکھوں میں موتی کے قطرے ڈبڈبائے ہوئے تھے اور بولا "کبھی کبھی تشریف لایا کیجئے گا۔"

میں نے صرف اتنا جواب دیا "میں آپ کا بہت مشکور ہوا۔"

(۳)

رفتہ رفتہ میری یہ حالت ہو گئی کہ جب تک مہر سنگھ کے یہاں جا کر دو

چار نغمے نہ سُن لوں۔ جی کو چین نہ آتا۔ شام ہوئی اور میں جا پہنچا۔ کچھ دیر تک نغمہ سرائیوں کی بہار لوٹتا اور تب اسے پڑھاتا۔ ایسے ذہین اور سمجھدار لڑکے کو پڑھانے میں مجھے خاص مزہ آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا میری ایک ایک بات اس کے دل پر نقش ہو رہی ہے۔ جب تک میں پڑھاتا وہ ہمہ تن گوش بنا بیٹھا رہتا۔ جب اسے دیکھتا پڑھنے لکھنے میں محو پاتا۔ سال بھر میں اپنے ذہن خداداد کے بدولت اس نے انگریزی میں اچھی استعداد حاصل کر لی معمولی چٹھیاں لکھنے لگا اور دوسرا سال گذرتے گذرتے وہ اپنے اسکول کے کل طلبا سے بازی لے گیا۔ جتنے مدرس تھے سب اس کی ذکاوت پر عش عش کرتے اور سیدھا۔ نیک چلن ایسا کہ کبھی جھوٹ موٹ بھی کسی نے اس کی شکایت نہیں کی۔ وہ سارے اسکول کی امید اور رونق تھا۔ لیکن باوجود سکھ ہونے کے اسے کھیل کود سے رغبت نہ تھی۔ میں نے اسے کبھی کرکٹ میں نہیں دیکھا۔ شام ہوتے ہی سیدھے گھر چلا آتا اور نوشت و خواند میں مصروف ہو جاتا ؂

میں رفتہ رفتہ اس سے ایسا مانوس ہو گیا کہ بجائے شاگرد کے دوست سمجھنے لگا۔ سن کے لحاظ سے اس کی سمجھ حیرت انگیز تھی۔ دیکھنے میں سولہ سترہ سال سے زائد نہ معلوم ہوتا۔ مگر جب کبھی میں روانی میں آکر دقیق شاعرانہ خیالات و نازک جذبات کی اس کے سامنے تشریح کرتا تو مجھے اس کے بشرے سے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ایک ایک نقطے کو سمجھ رہا ہے۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا ؂

"مہر سنگھ! تمہاری شادی ہو گئی ہے؟"

مہر سنگھ نے شرما کر جواب دیا۔ "ابھی نہیں۔"
میں۔ "تمہیں کیسی عورت پسند ہے؟"
مہر سنگھ۔ "میں شادی کروں ہی گا نہیں۔"
میں۔ "کیوں۔؟"
مہر سنگھ۔ "مجھ جیسے جاہل مطلق کے ساتھ شادی کرنا کوئی عورت پسند نہ کرے گی۔"
میں۔ "بہت کم ایسے نوجوان ہوں گے جو تم سے زیادہ لائق ہوں یا تم سے زیادہ سمجھ رکھتے ہوں۔"
مہر سنگھ نے میری طرف حیرت سے دیکھ کر کہا۔ "آپ دل لگی کرتے ہیں۔"
میں۔ "دل لگی نہیں میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے خود حیرت ہوتی ہے کہ اتنے کم دنوں میں تم نے اتنی استعداد کیوں پیدا کرلی۔ ابھی تمہیں انگریزی شروع کئے ہوئے تین برس سے زیادہ نہیں ہوئے۔"
مہر سنگھ۔ "کیا میں کسی تعلیم یافتہ لیڈی کو خوش رکھ سکوں گا۔"
میں۔ (جوش سے) "بیشک!"

(۵)

گرمی کا موسم تھا۔ میں ہوا کھانے شملہ گیا ہوا تھا۔ مہر سنگھ بھی میرے ساتھ تھا۔ وہاں میں بیمار پڑا۔ چیچک نکل آئی۔ تمام جسم میں آبلے پڑ گئے۔ پشت کے بل چارپائی پر پڑا رہتا۔ اس وقت مہر سنگھ نے میرے ساتھ جو احسانات کئے۔ وہ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ڈاکٹروں کی سخت ممانعت تھی کہ وہ

میرے کمرے میں نہ آدے مگر مہر سنگھ آٹھوں پہر میرے ہی پاس بیٹھا رہتا ۔ مجھے کھلاتا۔ پلاتا۔ اٹھاتا۔ بٹھاتا۔ رات رات بھر چارپائی کے قریب بیٹھ کر جاگتے رہنا مہر سنگھ ہی کا کام تھا۔ حقیقی بھائی بھی اس سے زیادہ خدمت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک مہینہ گذر گیا۔ میری حالت روز بروز ردی ہوتی جاتی تھی۔ ایک روز میں نے ڈاکٹر کو مہر سنگھ سے کہتے ہوئے سنا۔ "ان کی حالت نازک ہے۔" مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اب نہ بچوں گا۔ مگر مہر سنگھ کچھ ایسی مستقل مزاجی سے میری تیمارداری میں مصروف تھا گویا وہ مجھے زبردستی موت کے منہ سے بچا لے گا۔ ایک روز شام کے وقت میں کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ کسی کے سسکی لینے کی آواز آئی۔ وہاں بجز مہر سنگھ کے اور کوئی نہ تھا۔ میں نے پوچھا۔ "مہر سنگھ! مہر سنگھ! تم روتے ہو۔"

مہر سنگھ نے ضبط کر کے کہا "نہیں۔ روؤں کیوں" اور میری طرف بڑی دردمندانہ نگاہ سے دیکھا۔

میں۔ "تمہارے سسکنے کی آواز آئی۔"

مہر سنگھ۔ "وہ کچھ بات نہ تھی۔ گھر کی یاد آ گئی تھی۔"

میں۔ "سچ بولو۔"

مہر سنگھ کی آنکھیں پھر پُرنم ہو گئیں۔ اس نے میز پر سے آئینہ اُٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ یا نارائن! میں خود اپنے تئیں پہچان نہ کر سکا۔ چہرہ اس قدر تبدیل ہو گیا تھا۔ رنگت بجائے سرخ کے سیاہ ہو رہی تھی۔ اور چیچک کے بدنما داغوں نے صورت مسخ کر دی تھی۔ اپنی یہ حالت زار دیکھ کر مجھ سے بھی

ضبط نہ ہو سکا اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وجاہت جس پر مجھے اس قدر ناز تھا، بالکل رخصت ہو گئی تھی ٭

(۶)

میں شملہ سے واپس آنے کی تیاری کر رہا تھا۔ مہر سنگھ اسی روز مجھ سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ میری طبیعت بہت اچاٹ ہو رہی تھی اسباب سب بندھ چکا تھا کہ ایک گاڑی میرے دروازے پر آ کر رکی اور اس میں کون اُترا؟ مس لیلا! میری آنکھوں کو اعتبار نہ ہوا۔ متحیر ہو کر تاکنے لگا۔ مس لیلا وتی نے آگے بڑھ کر مجھے سلام کیا اور ہاتھ ملانے کو بڑھایا۔ میں نے اضطراری طور پر ہاتھ کو بڑھا دیا۔ مگر ابھی تک یہ یقین نہیں ہوا تھا کہ آیا خواب دیکھ رہا ہوں یا حقیقت ہے۔ لیلا کے رخساروں پر وہ سرخی تو نہ تھی۔ نہ وہ چلبلا پن بلکہ وہ بہت متین اور زرد ہو رہی تھی۔ آخر میری حیرت کم نہ ہوتے دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کر کے کہا۔ "تم کیسے جنٹلمین ہو کہ ایک شریف لڑکی کو بیٹھنے کے لئے کرسی بھی نہیں دیتے۔"

میں نے اندر سے کرسی لا کر اس کے لئے رکھ دی۔ مگر ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ خواب دیکھ رہا ہوں۔"

لیلا وتی نے کہا۔ "شاید تم مجھے بھول گئے۔"

میں۔ "بھول تو عمر بھر نہیں سکتا۔ مگر آنکھوں کا اعتبار نہیں آتا۔"

لیلا۔ "تم تو بالکل پہچانے نہیں جاتے۔"

میں۔ "تم بھی تو وہ نہیں رہیں۔ مگر آخر یہ راز کیا ہے؟ کیا تم جنت سے لوٹ آئیں؟"

لیلا۔ "میں تو نینی تال میں اپنے ماموں کے ہاں تھی۔"

میں: "اوہ مجھے چٹھی کس نے لکھی تھی۔ اور تار کس نے دیا تھا؟"

لیلا: "میں نے ہی۔"

میں۔ "کیوں؟ تم نے مجھے یہ دھوکا کیوں دیا۔ شاید تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ میں نے تمہارے ماتم میں کتنی تکلیف اٹھائی ہے۔"

مجھے اس وقت ایک انوکھا غصہ آیا۔ یہ پھر میرے سامنے کیوں آگئی؟ مر گئی تھی تو مری رہتی۔

لیلا۔ "اس میں مصلحت تھی مگر یہ باتیں تو پھر ہوتی رہیں گی۔ آؤ اس وقت تمہیں اپنے ایک لیڈی فرینڈ سے انٹروڈیوس کراؤں۔ وہ تمہاری ملاقات کی بہت مشتاق ہیں۔"

میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ "میری ملاقات کی!" مگر لیلا وتی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر گاڑی کے سامنے لے گئی۔ اس میں ایک نازنین ہندوستانی کپڑے پہنے بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے لیلا کی طرف مستفسر نگاہوں سے دیکھا۔

لیلا۔ "کیا تم نے نہیں پہچانا؟"

میں۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ اور اگر دیکھا بھی ہو تو گھونگھٹ کی آڑ سے کیونکر پہچان سکتا ہوں۔"

لیلا۔ "یہ تمہاری بیوی کمدنی ہیں۔"

میں نے استعجاب کے لہجے میں کہا "کمدنی! یہاں؟"

لیلا۔ "کمُدنی! منہ کھول دو۔ اور اپنے پیارے شوہر کا خیر مقدم کرو۔"

کمُدنی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ذرا سا گھونگھٹ اٹھایا۔ لیلا نے سارا منہ کھول دیا۔ اور ایسا معلوم ہوا گویا بادل سے چاند نکل آیا۔ مجھے خیال آیا میں نے یہ چہرہ شاید کہیں دیکھا ہے۔ کہاں؟ اہا۔ اس کی ناک پر بھی تو وہی تل ہے۔ انگلی میں وہی انگوٹھی بھی ہے ؛

لیلا۔ "کیا سوچتے ہو۔ اب پہچانا۔"

میں۔ "میری کچھ عقل کام نہیں کرتی۔ یہی حلیہ بجنسہ میرے ایک پیارے دوست مہر سنگھ کا ہے۔"

لیلا۔ (مسکراکر) "تم تو ہمیشہ نگاہ کے تیز بنتے تھے اتنا بھی نہیں پہچان سکتے۔"

میں خوشی سے پھول اُٹھا۔ کمُدنی مہر سنگھ کے بھیس میں! میں نے اسی وقت گلے سے لگالیا اور خوب دل کھول کر پیار کیا۔ ان چند لمحوں میں مجھے جو مسرت حاصل ہوئی اس کے مقابلے میں زندگی بھر کی خوشیاں ہیچ ہیں۔ ہم دونوں ہم آغوش تھے۔ کمدنی۔ پیاری کمدنی کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ہاں آنکھوں سے اشک جاری تھا ؛

مس لیلا باہر کھڑی ہمدردانہ نگاہوں سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر کہا۔ "پیاری لیلا تم سچی دیوی ہو۔ ہم جب تک جئیں گے تمہارے ممنونِ احسان رہیں گے۔" لیلا کے چہرے پر ایک ہلکا سا تبسم دکھائی دیا۔ بولی۔ "اب تو شاید تمہیں میرے ماتم کا کافی صلہ مل گیا۔"

عشقِ دنیا اور حُبِّ وطن

شہر لندن کے ایک پرانے خستہ حال ہوٹل میں۔ جہاں سرِ شام سے اندھیرا ہو جاتا ہے۔ جس خطہ میں فیشن ایبل لوگ آنا ہی گناہ سمجھتے ہیں اور جہاں قمار بازی، شراب خواری اور بدکاری کے نہایت عبرت ناک نظارے ہر دم پیشِ نظر رہتے ہیں۔ اس ہوٹل میں اس بدکاریوں کے اکھاڑے میں اطالیہ کا نامور محبِ وطن میزینی خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا وجیہہ چہرہ زرد ہے آنکھوں سے فکر برس رہی ہے۔ ہونٹ خشک ہیں اور شاید مہینوں سے حجامت درست نہیں ہوئی کپڑے میلے کچیلے ہیں۔ کوئی شخص جو میزینی سے پہلے واقف نہ ہو اسے دیکھ کر یہ خیال کرنے سے نہیں رُک سکتا کہ یہ بھی انہیں محروم القسمت شخصوں میں ہے جو اپنے نفس کے غلام ہو کر ذلیل ترین حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں:۔

میزینی اپنے خیالات میں غرق ہے۔ آہ! بدنصیب قوم! اے مظلوم اٹلی! کیا تیری قسمتیں کبھی نہ سدھریں گی۔ کیا تیرے سینکڑوں سپوتوں کا خون ذرا بھی نہ رنگ لائے گا۔ کیا تیرے ہزارہا جلاوطن۔ دیس سے نکالے ہوئے جاں نثاروں کی آہوں میں ذرا بھی تاثیر نہیں! کیا تو ظلم و جفا۔ غلامی اور اطاعت گذاری کے دام میں ہمیشہ گرفتار رہے گی۔ غالباً تجھ میں ابھی سدھرنے کی خود مختار بننے کی صلاحیت نہیں آئی۔ شاید تیری قسمت

میں کچھ دنوں اور ذلت و خواری جھیلنی لکھی ہے۔ آزادی! ہائے آزادی!
تیرے لئے میں نے کیسے کیسے دوست۔ جان سے پیارے دوست قربان
کئے۔ کیسے کیسے نوجوان۔ ہونہار نوجوان جن کی مائیں اور بیویاں آج ان
کی قبر پر آنسوں بہا رہی ہیں اور اپنے آلام و مصیبت سے بیزار ہو کر
ان کی جدائیوں کی تکلیف میں۔ بد قسمت۔ حرمان نصیب۔ آفت رسیدہ میزینی
کو بد دعائیں دے رہی ہیں۔ کیسے کیسے جو دشمنوں کے مقابل پیٹھ پھیرنا نہ
جانتے تھے۔ کیا یہ سب قربانیاں۔ کیا یہ سب نذریں کافی نہیں ہیں؟ آزادی تو
ایسی قیمتی شے ہے!!! ہاں تو پھر میں کیوں زندہ ہوں۔ کیا یہ دیکھنے کے لئے
کہ میرا پیارا وطن۔ میرا پیارا دیس دغا پرست۔ جفا شعار دشمنوں کے پیروں تلے
روندا جائے۔ میرے پیارے بھائی میرے پیارے ہم وطن جور و تعدی کا
شکار نبیں۔ نہیں میں یہ دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہ سکتا!!

میزینی انہیں خیالات میں غرق تھا کہ اس کا دوست رفیتی۔ جو اس کے
ساتھ جلا وطن کیا گیا تھا اس کوٹھری میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بسکٹ
کا ٹکڑا تھا۔ رفیتی عمر میں اپنے دوست سے دو چار برس چھوٹا تھا۔ بشرے
سے شرافت جھلک رہی تھی۔ اس نے میزینی کا شانہ پکڑ کر ہلایا اور کہا "جوزف
یہ لو۔ کچھ کھا لو۔ میزینی نے چونک کر سر اٹھایا اور بسکٹ دیکھ کر بولا" یہ کہاں سے
لائے تمہارے پاس پیسے کہاں تھے؟"

رفیتی۔ "پہلے کھا لو پھر یہ باتیں پوچھنا۔ تم نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا ہے
میزینی۔ "پہلے یہ بتا دو کہاں سے لائے جیب میں تمباکو کا ڈبہ بھی نظر آتا

ہے۔ اتنی دولت کہاں سے ہاتھ لگی!"

رفیتی:۔ "پوچھ کر کیا کرو گے۔ وہی اپنا نیا کوٹ جو والدہ نے بھیجا تھا گرو رکھ آیا ہوں۔"

میتزینی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ زمین پر گر پڑے۔ روتے ہوئے بولا۔ "یہ تم نے کیا حرکت کی۔ کرسمس کے دن آتے ہیں۔ اس وقت کیا پہنو گے۔ کیا اطالیہ کے ایک لکھ پتی تاجر کا اکلوتا بیٹا کرسمس کے دن بھی ایسے ہی پھٹے پرانے کوٹ میں بسر کرے گا۔ این!

رفیتی:۔ "کیوں کیا اس وقت تک کچھ آمدنی نہ ہو گی۔ ہم تم دونوں نئے جوڑے بنوائیں گے۔ اور اپنے پیارے وطن کی آنے والی آزادی کے نام پر خوشیاں منائیں گے۔"

میتزینی:۔ "آمدنی کی تو کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ جو مضمون ماہواری رسالوں کے لئے لکھے گئے تھے وہ واپس ہی آ گئے۔ گھر سے جو کچھ ملتا ہے وہ کب کا ختم ہو چکا۔ اب اور کونسا ذریعہ ہے؟"

رفیتی:۔ "ابھی کرسمس کو ہفتہ بھر پڑا ہے۔ ابھی سے اس کی کیا فکر کریں اور اگر بالفرض یہی کوٹ پہنا تو کیا؟ تم نے نہیں میری بیماری میں ڈاکٹر کی فیس کے لئے میگڈالن کی انگوٹھی بیچ ڈالی تھی۔ میں عنقریب یہ واقعہ اسے لکھنے والا ہوں۔ دیکھنا تمہیں کیسا بناتی ہے۔"

(۲)

کرسمس کا دن ہے۔ لندن میں ہر چہار طرف مسرت کی گرم بازاری ہے۔ صغیر و کبیر۔ امیر و غریب سب اپنے اپنے گھر خوشیاں منا رہے ہیں اور اپنے نفیس سے نفیس کپڑے پہن کر کلیساؤں میں جا رہے ہیں۔ کوئی مغموم صورت نظر نہیں آتی۔ ایسے وقت میں میزینی اور رفیتی دونوں اسی تنگ و تار حجرے میں سر جھکائے خاموش بیٹھے ہیں۔ میزینی ٹھنڈی آہیں بھر رہا ہے اور رفیتی رہ رہ کر دروازے پر آتا ہے اور بدقسمت شرابیوں کو معمول سے زیادہ بہکتے اور دیوانہ پن کی حرکتیں کرتے دیکھ اپنے بے نوائی اور ناداری کی فکر دور کرنا چاہتا ہے۔ افسوس! اطالیہ کا سرتاج جس کی ایک للکار پر ہزاروں آدمی اپنا خون بہانے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ آج ایسا محتاج ہو رہا ہے کہ اسے کھانے کا ٹھکانا نہیں۔ حتیٰ کہ آج صبح سے اس نے ایک سگار بھی نہیں پیا۔ تمباکو ہی دنیا کی وہ نعمت تھی جس سے وہ دست بردار نہیں ہو سکتا تھا اور وہ بھی اسے آج نصیب نہیں ہوا۔ مگر اس وقت اسے اپنی فکر نہیں۔ رفیتی۔ نوجوان خوشحال اور خوش رو ہونہار رفیتی کی فکر اسے سوہان روح ہو رہی ہے۔ وہ پوچھتا ہے مجھے کیا حق ہے کہ میں ایک ایسے شخص کو اپنے ساتھ عسرت کی تکلیفیں جھیلنے پر مجبور کروں جس کے خیر مقدم کے لئے دنیا کی سب نعمتیں آغوش کھولے ہوئے کھڑی ہیں۔

اتنے میں ایک چٹھی رساں نے پوچھا جوزف میزینی یہاں کہیں رہتا ہے
اپنی چٹھی لے جا۔ رفیق نے خط لے لیا اور جوشِ مسرت سے اچھل کر بولا "جوزف
یہ لو میگڈالن کا خط ہے!"

میزینی نے چونک کر خط لے لیا اور بڑی بے صبری سے کھولا۔ لفافہ کھولتے
ہی چند بالوں کا ایک گچھا گر پڑا۔ جو میگڈالن نے کرسمس کے تحفے کے طور پر
بھیجا تھا۔ میزینی نے اس گچھے کو بوسہ دیا اور اسے اٹھا کر اپنے سینے کی جیب
میں ٹھونس لیا۔ خط میں یہ لکھا ہوا تھا:

"مائی ڈیر جوزف! یہ ناچیز تحفہ قبول کرو۔ خدا کرے تمہیں ایک سو کرسمس
دیکھنے نصیب ہوں۔ اس یادگار کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنا اور غریب میگڈالن
کو بھولنا مت۔ میں اور کیا لکھوں کلیجہ منہ کو آیا جاتا ہے۔ ہائے جوزف! میرا
پیارا آقا۔ میرا مالک جوزف! تو مجھے کب تک تڑپائے گا۔ اب ضبط نہیں ہوتا۔
آنکھوں میں آنسو امڈ آئے ہیں۔ میں تیرے ساتھ مصیبتیں جھیلوں گی۔ فاقوں
مروں گی۔ یہ سب مجھے گوارہ ہے مگر تجھ سے جدا رہنا گوارہ نہیں۔ تجھے
قسم ہے۔ تجھے اپنے ایمان کی قسم ہے۔ تجھے اپنے وطن کی قسم! یہاں آجا آ جا۔
تجھے میری قسم۔ آنکھیں ترس رہی ہیں۔ کب تجھے دیکھوں گی۔ کرسمس قریب
ہے! مجھے کیا جب تک زندہ ہوں تیری ہوں۔

تمہاری میگڈالن

(۳)

میگڈالن کا گھر سوئٹزرلینڈ میں تھا۔ وہ ایک مرفہ حال تاجر کی بیٹی تھی اور انتہا

درجہ کی حسینہ و جمیلہ۔ حسن باطن میں بھی اس کا نظیر نہ تھا۔ کتنے ہی امراء و روٗسا
اس کا سودا سر میں رکھتے تھے۔ مگر وہ کسی کو کچھ خیال میں نہ لاتی تھی۔ میزینی جب
اطالیہ سے بھاگا تو سوئٹزرلینڈ میں آکر پناہ گزیں ہوا میگڈالن اس وقت
بھولے بھالے شباب کی گود میں کھیل رہی تھی۔ میزینی کی سرفروشیوں کی تعریفیں
پہلے ہی سے سن چکی تھی۔ کبھی کبھی اپنی ماں کے ساتھ اس کے یہاں آنے لگی۔ اور
باہمی ارتباط جو بڑھا اور میزینی کے محاسن باطنی کا جوں جوں اس کے دل پر نقش
ہوتا گیا اس کی محبت اس کے دل میں پختہ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے ایک دن
جوش شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر میزینی کے پیروں پر سر رکھ کر کہا: "مجھے اپنی
خدمت میں قبول کیجئے۔"

میزینی پر بھی اس وقت شباب کا عالم تھا۔ قومی تفکرات نے ابھی دل کو پژمردہ
نہیں ہونے دیا تھا۔ جوانی کی پرجوش امیدیں دل میں موجزن ہو رہی تھیں۔ مگر اس نے
عہد کر لیا تھا کہ میں ملک و قوم پر اپنے تئیں نثار کروں گا اور اس عہد پر
قائم رہا۔ ایک ایسی نازنین کے نازک نازک لبوں سے ایسی درخواست سن کر
رد کر دینا میزینی ہی جیسے اعتقاد کے پکے۔ ہماؤ کے پورے آدمی کا کام تھا۔

میگڈالن باچشم تر اٹھی۔ مگر مایوس نہ ہوئی تھی۔ اس ناکامی نے اس کے دل
میں آتش محبت اور بھی تیز کر دی اور گو آج میزینی کو سوئٹزرلینڈ چھوڑے کئی
سال گذرے۔ مگر وفادار میگڈالن ابھی تک میزینی کو نہیں بھولی۔ دنوں کے
ساتھ اس کی محبت اور بھی بجی اور گاڑھی ہوتی جاتی ہے۔

میزینی جب خط پڑھ چکا تو ایک لمبی آہ بھر کر رفیق سے بولا۔" دیکھا

میگڈالن کیا کہتی ہے؟"

رفیقی:- اس غریب کی جان لے کر دم لوگے۔"

میزینی پھر خیال میں ڈوبا۔"میگڈالن" تو نوجوان ہے حسین ہے۔ خدا نے تجھے دولت بے انتہا عطا کی ہے۔ تو کیوں ایک غریب دکھیا رے۔ مفلس۔ قلاش اور غربت زدہ شخص کے پیچھے اپنی زندگی مٹی میں ملا رہی ہے۔ مجھ جیسا مایوس آفت زدہ مصیبتوں کا مارا شخص تجھے کیونکر خوش رکھ سکے گا۔ نہیں نہیں میں ایسا خود غرض نہیں ہوں۔ دنیا میں ایسے بہت سے شگفتہ مزاج۔ خوشحال نوجوان ہیں جو تجھے خوش رکھ سکتے ہیں۔ جو تیری پرستش کر سکتے ہیں۔ کیوں تو ان میں سے کسی کو اپنی غلامی میں نہیں لے لیتی۔ میں تیری محبت۔ سچے، نیک اور بے غرض محبت کی قدر کرتا ہوں۔ مگر میرے لئے جس کا دل قوم اور وطن پر نثار ہو چکا ہے۔ تو بجز ایک پیاری اور ہمدرد بہن کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ مجھ میں ایسی کیا خوبی ہے۔ ایسے کون سے اوصاف ہیں کہ تجھ جیسی دیوی میرے لئے ایسی مصیبتیں جھیل رہی ہے۔ آہ! میزینی کمبخت میزینی۔ تو کہیں کا نہ ہوا جن کے لئے تو نے اپنے تئیں نثار کر دیا۔ وہ تیری صورت سے بیزار ہیں۔ جو تیرے ہمدرد ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ تو خواب دیکھ رہا ہے!" ان خیالات سے بے بس ہو کر میزینی نے قلم دوات نکالی اور میگڈالن کو خط لکھنا شروع کیا!!

(۴)

"پیاری میگڈالن! تمہارا خط معہ بیش بہا تحفہ کے آیا۔ میں تمہارا تہ دل سے

مشکور ہوں کہ تم نے مجھ جیسے بیکس وبے بس شخص کو اس تحفہ کے قابل سمجھا۔ میں اس کی ہمیشہ قدر کروں گا۔ یہ میرے پاس ہمیشہ ایک سچی۔ بے غرض اور غیر فانی محبت کی یادگار رہے گا اور جس وقت یہ جسم خاکی آغوش لحد میں جائے گا میری آخری وصیت یہ ہوگی کہ یہ یادگار میرے جنازے کے ساتھ دفن کر دی جائے۔ میں شاید خود اس تقویت کا اندازہ نہیں لگا سکتا جو مجھے اس خیال سے ہے کہ دنیا میں جہاں ہر چہار طرف میری نسبت بدگمانیاں پھیل رہی ہیں۔ کم از کم ایک ایسی فرشتہ خصال عورت ہے جو میری نیتوں کی صفائی اور میری آلائشوں سے پاک کوششوں پر پکا اعتقاد رکھتی ہے اور شاید تمہارے ہی ہمدردی کا یقین ہے کہ میں زندگی کے ایسے سخت امتحانات میں کامیاب ہوتا جاتا ہوں۔

مگر پیاری بہن مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ تم میری تکلیفوں کے خیال سے اپنا دل مت دکھانا۔ میں بہت آرام سے ہوں۔ تمہاری محبت جیسی لازوال دولت پاکر بھی اگر میں چند جسمانی تکالیف کا رونا روؤں تو مجھ جیسا بدقسمت شخص دنیا میں کون ہوگا ؟

میں نے سنا ہے تمہاری صحت روز بروز بدتر ہوتی جاتی ہے۔ میرا جی بے اختیار چاہتا ہے کہ تجھے دیکھوں۔ کاش میں آزاد ہوتا۔ کاش میرا دل اس قابل ہوتا کہ تیرے نذر کیا جاتا۔ مگر ایک پژمردہ افسردہ دل تیرے قابل نہیں میگڈالن! خدا کے واسطے اپنی صحت کا خیال رکھو۔ مجھے شاید اس سے زیادہ اور کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی کہ پیاری میگڈالن تکلیف میں ہے اور میرے لئے! تیری پاکیزہ صورت اس وقت نگاہوں کے سامنے ہے! میگڈالن! دیکھو مجھ سے ناراض نہ ہو! بخدا میں

تمہارے قابل نہیں۔ آج کرسمس کا دن ہے۔ تمہیں کیا تحفہ بھیجوں۔ خدا تم پر ہمیشہ اپنی بے انتہا برکات نازل کرتا رہے۔ اپنی ماں کو میری طرف سے سلام کہنا۔ تم لوگوں کے دیدار کی بہت آرزو ہے۔ دیکھیں کب تک یہ آرزو پوری ہوتی ہے ؂

تیرا جوزف

(۵)

اس واقعہ کے بعد بہت دن گذر گئے۔ جوزف میزینی پھر اطالیہ پہنچا اور روم میں پہلی بار جمہوری سلطنت کا اعلان کیا گیا۔ تین شخص کاروبارِ سلطنت کے انصرام کے لئے منتخب کئے گئے۔ میزینی بھی ان میں ایک تھا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں فرانس کی زیادتیوں اور شاہ پیڈمانٹ کی دغا بازیوں کی بدولت اس جمہوری سلطنت کا انتزاع ہوگیا اور اس کے ارکان و مشیر اپنی جانیں لے کر بھاگ نکلے۔ میزینی اپنے معتمد دوستوں کی دغابازی و دنیا سازی پر پیچ و تاب کھاتا ہوا۔ خستہ حال و پریشان روم کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ اس کا یہ خواب کے روم کو میں ضرور ایک دن جمہوری سلطنت کا مرکز بنا کر چھوڑوں گا' پورا ہو کر پھر پریشان ہوگیا ؂

دوپہر کا وقت تھا دھوپ سے آشفتہ حال ہو کر وہ ایک درخت کے سایہ میں ذرا دم لینے کے لئے ٹھہر گیا کہ سامنے سے ایک لیڈی آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کا چہرہ زرد تھا کپڑے بالکل سفید اور سادہ۔ سن تیس سال سے متجاوز۔ میزینی خود فراموشی کے عالم میں تھا کہ نازنین جوشِ محبت سے بیتاب ہو کر اس کے گلے لپٹ گئی۔ میزینی نے چونک کر دیکھا! بولا۔ "پیاری میگڑالن

تم ہو۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پرُنم ہو گئیں۔ میگڈالن نے رو کر کہا جوزف اور منہ سے کچھ نہ نکلا ﴿

دونوں خاموش کئی منٹ تک روتے رہے۔ آخر میر بنی بولا: "تم یہاں کب آئیں میگا!"

میگڈالن ۔" میں یہاں کئی ماہ سے ہوں مگر تم سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں نکلتی تھی۔ تمہیں کاروبار میں محو دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ اب تمہیں مجھ جیسی عورت کی ہمدردی ضرورت باقی نہیں رہی۔ تم سے ملنے کی کوئی ضرورت نہ دیکھتی تھی (رک کر) کیوں جوزف یہ کیا سبب ہے کہ اکثر لوگ تمہاری برائی کیا کرتے ہیں۔ کیا وہ اندھے ہیں۔ کیا خدا نے انہیں آنکھیں نہیں دیں؟"

جوزف ۔" میگا غالباً وہ لوگ سچ کہتے ہوں گے۔ فی الواقع مجھ میں وہ اوصاف نہیں ہیں جو میں نخوت کے باعث اکثر کہا کرتا ہوں کہ مجھ میں ہیں۔ یا جنہیں تم اپنی سادگی اور پاک نفسی سے مجھ میں موجود سمجھتی ہو۔ میری کمزوریاں روز بروز مجھے معلوم ہوتی جاتی ہیں۔"

میگڈالن ۔" جبھی تو تم اس قابل ہو کہ میں تمہاری پرستش کروں۔ مبارک ہے وہ انسان جو خودی کو مٹا کر اپنے تئیں ہیچ سمجھنے لگے۔ جوزف! خدا کے لئے مجھے یوں مت جدا کرو۔ میں تمہاری ہو گئی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم ویسے ہی پاک و صاف ہو جیسا ہمارا یسوع تھا۔ یہ خیال میرے دل میں نقش ہو گیا ہے اور اگر اس میں ذرا کمزوری آ گئی تھی تو تمہاری اس وقت کی گفتگو

نے اسے اور بھی مضبوط کر دیا۔ بیشک تم فرشتے ہو مگر مجھے افسوس ہے کہ دنیا میں کیوں لوگ اس قدر کوتاہ نظر اور کم بیں ہوتے ہیں اور خصوصاً وہ لوگ جنہیں میں تنگ خیالوں سے بالاتر سمجھتی تھی۔ رفینی۔ رماری۔ نوپلائی۔ برناپاس یہ سب کے سب تمہارے دوست ہیں۔ تم انہیں اپنا دوست سمجھتے ہو مگر وہ سب تمہارے دشمن ہیں اور انھوں نے مجھ سے میرے روبرو سینکڑوں ایسی باتیں تمہارے نسبت کہی ہیں جس کا میں مر کر بھی یقین نہیں کر سکتی۔ وہ سب غلط لغو بکتے ہیں۔ ہمارا پیارا جوزف ویسا ہی ہے جیسا میں سمجھتی تھی۔ بلکہ اس سے بھی افضل۔ کیا یہ بھی تمہاری ایک ذاتی خوبی نہیں ہے کہ تم اپنے دشمنوں کو بھی اپنا دوست سمجھتے ہو۔"

جوزف سے اب صبر نہ ہوسکا۔ اس نے میگڈالن کے زرد ہاتھوں کو بوسہ دے کر کہا۔ "پیاری میگا! میرے دوست بے قصور ہیں اور میں خود خطاوار ہوں۔ (رو کر) جو کچھ انھوں نے کہا وہ سب میرے ہی اشارے اور مرضی کے موافق تھا۔ میں نے تم سے نرو دغا ہی کی۔ مگر میری پیاری بہن یہ محض اس لئے تھا کہ تم میری طرف سے بے پروا ہو جاؤ اور اپنے شباب کے باقی دن مسرت سے بسر کرو۔ میں بہت نادم ہوں۔ میں نے تمہیں مطلق نہ سمجھا تھا۔ میں تمہاری محبت کی گہرائی سے ناواقف تھا۔ کیوں کہ جو میں چاہتا تھا اس کا الٹا اثر ہوا مگر مگا میں معافی کا خواست گار ہوں۔"

میگڈالن۔ "ہائے جوزف! تم مجھ سے معافی مانگتے ہو۔ ایں! تم دنیا کے سب انسانوں سے زیادہ نیک۔ زیادہ سچے اور زیادہ لائق ہو۔ مگر ہاں

بیشک تم نے مجھے بالکل نہ سمجھا تھا۔ جوزف! یہ تمہاری غلطی تھی۔ مجھے تعجب تو یہ ہے کہ تم اتنے سنگ دل کیونکر ہو گئے۔"

جوزف۔ "میگا! خدا جانتا ہے جب میں رفیقی کو یہ سب سکھا پڑھا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اس وقت میرے دل کی کیا کیفیت تھی۔ میں جو دنیا میں نیک نامی کی سب سے زیادہ وقعت سمجھتا ہوں اور جس نے حریفوں کے ذاتی حملوں کو بھی بلا کامل تردید کئے ہوئے نہ چھوڑا۔ اپنے منہ سے سکھاؤں کہ جاکر مجھے برا کہو۔ مگر یہ محض اس لئے تھا کہ تم اپنی صحت کا خیال رکھو اور مجھے بھول جاؤ۔"

حقیقت یہ تھی کہ میزینی نے میگڈالن کے عشق کو روز افزوں ہوتے دیکھ کر ایک خاص حکمت کی تھی۔ اسے خوب معلوم تھا کہ میگڈالن کے شیدائیوں میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جو اس سے زیادہ شکیل۔ زیادہ جری زیادہ دولت مند اور زیادہ ذہین ہیں مگر وہ کسی کو خیال میں نہیں لاتی۔ مجھ میں اس کے لئے جو خاص کشش ہے۔ وہ میرے چند اوصاف ہیں اور میرے ایسے احباب جن کی وقعت میگڈالن کی نگاہوں میں بھی ہے۔ اس سے میری شکایت کر کے ان اوصاف کی وقعت اس کے دل سے مٹا دیں تو وہ خود بخود مجھے بھول جائے گی۔ پہلے تو اس کے احباب اس فعل کے کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے مگر اس خوف سے کہ کہیں میگڈالن نے گھل گھل کر جان دے دی تو میزینی اپنی زندگی بھر ہمیں بھی نہ معاف کریگا، انھوں نے یہ ناگوار کام قبول کر لیا تھا۔ وہ سوئٹزرلینڈ گئے اور جہاں تک ان کی زبان میں گویائی

گویائی تھی اپنے دوست کی غیبت اور بدگوئی میں صرف کی۔ مگر میگڈالن پر محبت کا رنگ ایسا گہرا چڑھا ہوا تھا کہ ان کوششوں کا بجز اس کے اور کوئی نتیجہ نہ ہو سکتا تھا جو ہوا۔ وہ ایک روز بیقرار ہو کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور روم آکر ایک سرائے میں مقیم ہو گئی۔ یہاں اس کا روز کا وطیرہ تھا کہ میزینی کے پیچھے پیچھے اس کی نگاہ سے دور گھوما کرتی۔ مگر اسے مطمئن اور اپنی کامیابی سے خوش دیکھ کر اسے چھیڑنے کی جرات نہ کرتی تھی بالآخر جب پھر اس پر ناکامیوں کا وار ہوا اور وہ پھر دنیا میں بے کس و بے بس ہو گیا تو میگڈالن نے سمجھا اب اس کو کسی ہمدرد کی ضرورت ہے اور ناظرین دیکھ چکے ہیں جس طرح وہ میزینی سے ملی ؛

(۶)

میزینی روم سے پھر انگلستان پہنچا اور یہاں وہ عرصے تک مقیم رہا۔ ۱۸۷۰ء میں اسے خبر ملی کہ سسلی کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہے اور انہیں میدان جنگ میں لانے کے لئے ایک محرک کی ضرورت ہے۔ بس وہ فوراً سسلی پہنچا مگر اس کے جانے کے قبل شاہی فوج نے باغیوں کو زیر کر دیا تھا میزینی جہاز سے اترتے ہی گرفتار کر لیا گیا اور ایک زندان خانہ میں ڈال دیا گیا۔ مگر چونکہ اب وہ بہت ضعیف ہو گیا۔ حکام شاہی نے اس خوف سے کہ کہیں وہ تکالیف قید سے مر جائے تو رعایا کو شبہ ہو گا کہ بادشاہ کی تحریک سے وہ قتل کر ڈالا گیا۔ اسے رہا کر دیا۔ مایوس اور شکستہ دل میزینی پھر

سوئٹزلینڈ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی زندگی کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں
اس میں شک نہیں کہ اٹلی کے متفق اور متحد ہو جانے کے دن بہت قریب
آگئے تھے مگر اس کی حکومت کی حالت اس سے ہرگز بہتر نہ تھی جیسی آسٹریا نیلز
کے عہد حکومت میں۔ فرق یہ تھا کہ پہلے وہ ایک غیر قوم کی زیادتیوں سے نالاں
تھے اب اپنے قوم کے ہاتھوں خستہ و خوار۔ ان متواتر ناکامیوں نے مستقل مزاج
میزینی کے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ غالباً عوام کی ملکی تعلیم اس حد تک نہیں
ہوئی ہے کہ وہ اپنے لئے ایک جمہوری طرزِ حکومت کی بنیاد ڈالیں۔ اور اس
نیت سے وہ سوئٹزلینڈ جا رہا تھا کہ وہاں سے ایک زبردست قومی اخبار
نکالے۔ کیونکہ اطالیہ میں اسے اپنے خیالات کے اشاعت کی اجازت نہ تھی
وہ رات بھر نام تبدیل کر کے روم میں مقیم رہا۔ پھر وہاں سے اپنے نژاد بوم
جنیوا میں آیا اور اپنی پاک خصال ماں کی قبر پر پھول چڑھائے۔ بعد ازاں
سوئٹزلینڈ کی طرف چلا اور سال بھر تک چند معتمد احباب کی اعانت سے
اخبار نکالتا رہا۔ مگر متواتر تفکرات اور مصائب نے اسے بالکل لاغر اور
نحیف بنا دیا تھا۔ ۱۸۷۰ء میں صحت کے خیال سے انگلستان آرہا تھا کہ
کوہ آلپس کے دامن میں نمونیا کی بیماری نے سلسلۂ حیات منقطع کر دیا
اور وہ پُر ارمان دل لئے ہوئے جنت کو سدھارا۔ اٹلی کا نام مرتے دم تک
اس کی زبان پر تھا۔ یہاں بھی متعدد حامی۔ ہمدرد شریک تھے۔ اس کا جنازہ
بڑی دھوم سے نکلا۔ ہزارہا آدمی ساتھ تھے اور ایک بڑے پُرفضا۔ فرحت بخش مقام
پر ایک شفاف چشمے کے کنارے پر اس فنانی القوم کو سلا دیا گیا۔

(۷)

میرینی کو کنج لحد میں سوئے ہوئے آج تین دن گذر گئے۔ شام کا وقت تھا۔ سورج کی زرد شعاعیں اس تازہ قبر پر حسرت ناک نگاہوں سے تاک رہی ہیں کہ ایک ادھیڑ عورت۔ خوبصورت شہانے جوتے پہنے لڑکھڑاتی ہوئی آئی۔ یہ میگڈالن تھی۔ اس کا چہرہ نہایت مغموم و پژمردہ تھا۔ گویا اب اس جسم میں جان نہیں باقی رہی وہ اس قبر کے سرہانے بیٹھ گئی اور اپنے سینے پر رکھے ہوئے پھول اس پر چڑھائے۔ پھر دوزانو ہو کر صدق دل سے دعا کرتی رہی۔ جب خوب اندھیرا ہو گیا۔ برف پڑنے لگی تو وہ چپکے سے اٹھی اور خاموش سر جھکائے قریب کے ایک گاؤں میں جا کر رات بسر کی اور علی الصباح اپنے مکان کی طرف روانہ ہوئی میگڈالن اب اپنے گھر کی مالک تھی۔ اس کی ماں بہت عرصہ ہوا انتقال کر گئی تھی۔ اس نے میرینی کے نام سے ایک خانقاہ بنوائی اور خود خانقاہ نشین عیسائی لیڈیوں کے لباس میں وہاں شب و روز رہنے لگی۔ میرینی کا نام اس کے لئے نہایت پُردرد اور دلکش نغمے سے کم نہ تھا۔ ہمدردوں اور قدردانوں کے لئے اس کا گھر خانۂ بے تکلف تھا۔ میرینی کے خطوط۔ اس کی انجیل اور میرینی کا نام اس کا معبود تھا آس پاس کے غریب لڑکے اور مفلس بیویوں کے لئے یہی بابرکت نام حصولِ معاش کا وسیلہ تھا۔

میگڈالن

تین برس تک زندہ رہی اور جب مری تو اپنی آخری وصیت کے مطابق اُسی خانقاہ مین دفن کیگئی۔ اِس کا عشق معمولی محبت نہ تھا۔ بلکہ وہ ایک پاک و بے لوث جذبہ تھا۔ اور وہ ہمکو اُن پریم رس مین ڈوبی ہوئی گوپیون کی یاد دلاتا ہے جو سری کرشن کے پریم مین بندرابن کی کُنجون اور گلیونمین منڈلایا کرتی تھین۔ جو اُس سے ملے ہونے پر بھی اُس سے الگ تھین۔ اور جن کے دلون مین پریم کے سوا اور کسی چیز کی جگہ نہ تھی میزینی کی خانقاہ آج تک قائم ہے۔ اور غُربا اور فقرا ابھی تک میزینی کا پاک نام لیکر وہان ہر طرح کی آسائش اور راحت پاتے ہین۔

تواب رائے۔